نشور واحدی

نشورؔ واحدی

ابتدائی دور میں

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی :

" انگریزی شعرا میں سوئن برن SWIN BORNE ہی ہے جس کی یاد اکثر نشورؔ واحدی مجھے دلاتے رہتے ہیں ۔ وہ زبان کے لحنی امکانات پر ایسی ہی گرفت رکھتے ہیں جیسا کہ سوئن برن "

نشورؔ واحدی

آخری دور میں

اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک

مشہور و غیر مطبوعہ

غزلوں کا مجموعہ

نشور واحدی

نام کتاب : ــــــــــ اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک

ایڈیشن : ــــــــــ بار اوّل

مصنّف : ــــــــــ نشور واحدی

ناشر : ــــــــــ مومنہ نشور واحدی

مُرتّب : ــــــــــ نیاز واحدی

سنِ اشاعت : ــــــــــ سنہ ۲۰۰۰ء

طباعت ــــــــــ یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

کتابت ــــــــــ محمد الیاس لکھنؤ

قلمی تصویر (نشور واحدی) — قلیپ پر — خرّم امیر، اٹاوہ، یوپی

بہ اہتمام محترمہ ثروت واحدی ۴/۲۰۸۔ نیو حیدر آباد، لکھنؤ

محترمہ عشرت واحدی، شیش محل، سرائے شیخ، اٹاوہ، یوپی

محترمہ شاہین امتیاز۔ ۴۴ علیگ اپارٹمنٹ علی گڑھ

ــــــــــ سرورق کی تصویر ــــــــــ

عزیزم خرّم امیر نے چار سال کی عمر میں اپنے نانا نشور واحدی کو دیکھا تھا، اس وقت نشور صاحب کے چہرے کے جو نقوش ان کے ذہن میں قائم ہوئے تھے اُسی کے پس منظر میں خرّم امیر نے یہ تصویر بنائی ہے۔
(مُرتّب)

اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک

مشہور و غیر مطبوعہ غزلوں کا مجموعہ:

صفحات ——— ٢٠٠
قیمت ——— ٧٥ روپے

تقسیم کار:
دانش محل، امین آباد، لکھنؤ، یوپی

ملنے کے پتے

• مکتبہ دین و ادب ——— امین آباد، لکھنؤ
• مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ——— اردو بازار جامع مسجد دہلی
• نیاز و احمدی ——— ٩٨/٣٧، ناظر باغ، بیکن گنج، کانپور
فون نمبر ٣١٨٥٣٠

فہرست مضامین

فہرستِ عنوانات

عنوانات	صفحہ نمبر
یہ فضائے نالۂ غم یہ فغانِ ناتوانی	۱۱۴
وفا ہو یا جفا ہو حسرت بالیدہ ہے وہ بھی	۱۱۵
ہر اک چہرے سے بے ربطی عیاں ہے	۱۱۶
مستقبلِ عالم کی انساں کو خبر کیا ہے	۱۱۷
ساقی کی بے گانہ روش پر کیا الزام لگایا جائے	۱۱۸
ہر قرار و ثبات گزرے ہے	۱۲۰
لبوں پہ گردِ ترنّم کبھی جمی بھی نہیں	۱۲۱
انہیں دیکھ کر ہم کہاں تک سنبھلتے	۱۲۲
پلکوں کے نرم سائے میں پلنا ہے آپ کو	۱۲۳
نام اُن کا زباں پر ابھی لائے نہ بنے ہے	۱۲۵
جا بجا ظلمتوں کا ڈیرا ہے	۱۲۷
"لکھنؤ" یہ شہر باغ ہے حضرت محل کی یادوں کا	۱۲۸
نظر کو مئے ارغوانی کہیں گے	۱۲۹
جو طوفاں کے مزے پائے ہوئے ہیں	۱۳۰
ہر نظر کو یہ تبسّم یہ پیام آتے نہیں	۱۳۲
وہ عمر جو دُنیا میں بسر کرتے رہے ہیں	۱۳۴
یہ آنسو جو پلکوں پہ آئے ہوئے ہیں	۱۳۶
ایک رات آتی ہے ایک رات جاتی ہے	۱۳۷
دل کی پریشانگی بہت ہے	۱۳۸

مضامین

صفحہ نمبر

عنوانات

صفحہ نمبر

عنوانات

صفحہ نمبر

تصانیفِ نشورؔ واحدی

شعری تخلیقات:

۱۔ صہبائے ہند
• پہلا ایڈیشن ۱۹۳۹ء — نامی پریس کان پور، یوپی
• دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۹ء — نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر

۲۔ شورِ نشور — ۱۹۴۳ء — آزاد وطن پریس انجمن وطن کان پور

۳۔ آتش و نم
• پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء — کتاب محل، الہ آباد، یوپی
• دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء — اسرار کریمی پریس، الہ آباد یوپی
• تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء — دیپک پریس نیا گاؤں لکھنؤ

۴۔ فروغِ جام
• پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹ء — ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ
• دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء — ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ

۵۔ سوادِ منزل — ۱۹۶۸ء — سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی

۶۔ نشور واحدی (انتخابِ کلامِ نشور) ۱۹۶۲ء — انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

۷۔ گل افشانیٔ گفتار — ۱۹۷۷ء — مکتبہ جامعہ ملیہ نئی آواز جامعہ نگر دہلی

۸۔ سلکِ شبنم — ۱۹۷۸ء — آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ

۹۔ پھولوں کی انجمن اردو (بچوں کی نظمیں) — ۱۹۹۰ء — سفینہ پبلی کیشنز صدیقی ہاؤس سلیم چوک قاضی کیمپ بھوپال

۱۰۔ عزمِ محکم پہلا ایڈیشن ۱۹۹۹ء — لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس گوئن روڈ لکھنؤ

۱۱۔ اشکِ جہاں سے عصرِ رواں تک پہلا ایڈیشن ۲۰۰۰ء — دیپک پریس نیا گاؤں لکھنؤ

۱۲۔ جواہر پارے (مرتبہ نشور واحدی) ۱۹۵۳ء — حلیم مسلم کالج کان پور کے یادگار مشاعرے کی یادگار

۱۳۔ نشور واحدی کی سرو شریسٹھ غزلیں (ہندی) ۱۹۶۰ء — اردو ہندی ساہتیہ سدن کانپور یوپی

نثری تخلیقات:

۱۔ دانشِ آخر الزماں ۱۹۶۶ء — تاج پریس ٹریکا پور کانپور

۲۔ تاریخ فلسفۂ خودی ایشیا ۱۹۷۹ء — لیتھو برقی پریس نئی سڑک کان پور

۳۔ ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء ۱۹۹۳ء — نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ امبیڈکر نگر یوپی

اشاعت کا آئندہ منصوبہ:

۱۔ مضامینِ نشور (غیر مطبوعہ)
۲۔ انتخابِ کلامِ نشور (غزلیات)
۳۔ فروغِ جام کا تیسرا ایڈیشن
۴۔ انتخابِ غزلیات (ہندی میں)
۵۔ تواریخ بنگالہ (فارسی سے ترجمہ) (غیر مطبوعہ)

نشور شناسوں کے
نام
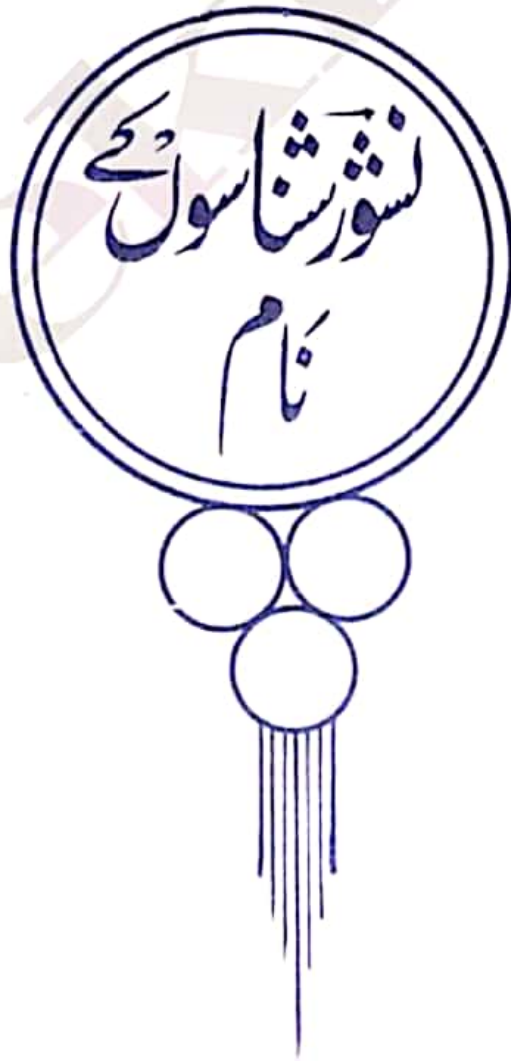
اُوراقِ کائنات میں اَب میں کہاں نشورؔ
اُفسانہ مِٹ گیا مِرا عنواں لئے ہُوئے!

ہستی کا ورق[له]

نام : حفیظ الرحمٰن

تخلص : نشورؔ

کُنیت : وَاحدی

وَالد کا نام : جمیل احمد یکتاؔ

ولادت : ۱۵ اپریل ۱۹۱۲ء بمقام چندائر، ضلع بلیا۔ یوپی

آبائی وطن : مُوضع چک حاجی عرف شیخ پور، ضلع بلیا، یوپی

آبائی نسبت : مخدُومانِ جونپور میں سے حضرت حاجی شاہ پھول جونپوری، جن کا نسبی تعلق علّامہ کمال الدّین سے ہے، جن کا مزارِ پاک خانقاہ چراغ دہلی میں وَاقع ہے۔

ابتدائی تعلیم : مَولوی عبد المجید کاتب دلوریا۔ یوپی ــ اور خانقاہ رشیدیہ جونپور میں مَولانا عبد القدیر سے۔

ثانوی تعلیم : ۱۳ سال کی عمر میں مدرسہ عالیہ مصباح العلوم الٰہ آباد بھیج دیئے گئے، جہاں عربی فارسی اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کی۔ قیامِ کان پور کے دوران طبِ یونانی اور انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کی۔

بیعت : ۱۵ سال کی عمر میں مولانا عبد الشکور چشتی قادری سہروردی سے بیعت حاصل کی۔

شادی خانہ آبادی : ۱۱ فروری ۱۹۳۰ء کو خان بہادر الحاج مَولوی حامد چشتی دلوریا یوپی کی منجھلی صاحبزادی مومنہ چشتی بیگم سے۔

له ریسرچ اسکالرس کے سوالات کی روشنی میں تفصیلات پیش کی جارہی ہیں۔

اُولادیں : دوبیٹیاں ثروت واحدی۔ عشرت واحدی۔ دوبیٹے نیاز واحدی اور امتیاز واحدی۔

دَاماد : ڈاکٹر سید محمد لقمان اعظمی ندوی لکھنؤ۔ محمد امیر شرر۔ اٹاوہ۔ یوپی

بَہو : شاہین امتیاز

پوتے اور پوتی : عبداللہ امتیاز۔ اسماء امتیاز۔

نواسے : کامران امیر، خسرو امیر، خرم امیر

خادمِ خاص : جمّن خاں ابن جناب تعلقیدار (مرحوم)

وطنِ ثانی : سنہ ۱۹۳۰ء میں کانپور تشریف لائے، اور پھر اسی کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔

درس و تدریس : مدرسہ ضیاء العلوم کانپور میں دس برس عربی و فارسی پڑھائی کان کبج کالج گرنرائن کھتری کالج کان پور میں پڑھانے کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں حلیم مسلم کالج کانپور میں پڑھانا شروع کیا اور وہیں سے سنہ ۱۹۷۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

آغازِ شاعری : ۱۳ سال کی عمر تھی جب اردو فارسی میں شعر کہنا شروع کیا۔

پہلا مجموعہ : ۲۲ سال کی عمر میں پہلا مجموعہ "صہبائے ہند" مرتب کیا جس کی اشاعت سنہ ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔

دیگر تصانیف : صہبائے ہند کے بعد شاعری و نثر کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور مقبول ہوئیں۔

اعزازات : قابلِ ذکر اعزازات سنہ ۱۹۶۹ء میں کان پور نگر مہا پالیکا کی طرف سے ایک مخصوص سرکاری جلسہ میں نشور صاحب کو سپاسنامہ پیش کر کے ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ سنہ ۱۹۷۴ء میں الہ آباد میں ۔ سنہ ۱۹۷۸ء میں ۔ کانپور میں بڑے پیمانے پر جشنِ نشور کا انعقاد کیا گیا۔

نقد و نظر : نشور صاحب کی شخصیت شاعری پر ۱۹۳۹ء سے اب تک بہت کچھ لکھا گیا اور انہیں ممتاز تنقید نگاروں نے موجودہ صدی کے بہترین غزل گو شعراء کی صف میں جگہ دی اور ان کی نثر نگاری کے معترف ہوئے۔

تحقیق : ڈاکٹر احمر لاری، سابق صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونی ورسٹی کی نگرانی میں ڈاکٹر محمد ارشد خانصاحب خالص پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی نے نشور صاحب کی شخصیت اور فن پر ۱۹۹۱ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ "نشور واحدی شخصیت اور فن" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی کام جاری ہے۔

وفات : ۴ جنوری ۱۹۸۳ء

تدفین : جناب خلیل اللہ ایڈوکیٹ کے قبرستان، بکرمنڈی بڑی عیدگاہ کانپور کے سامنے

●●●

امتیاز واحدی

اپنی بات

اس مجموعہ میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۸۲ء تک کہی گئی وہ غزلیں شامل ہیں، جو ان کے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہ ہو سکیں، نشور صاحب نے اپنی بیاض کے آخر میں تحریر کیا ہے کہ:

"جن غزلوں پر صلیبی نشان ہے وہ اور اس کے بعد کی غزلیں "اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک" میں شامل ہوں گی۔"

بیاض سے حاصل کی گئی غزلوں کے علاوہ بہت سی ایسی غزلیں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جو مختلف رسالوں اخباروں اور آڈیو کیسٹ میں نشور صاحب کی آواز میں ریکارڈ غزلوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

جناب شجاعت علی سندیلوی مرحوم نے یہ مشورہ دیا تھا کہ غزلوں کے نیچے سن و تاریخ درج کی جائے اور نشور صاحب کی زندگی کے آخری دور کی غزلوں سے ہی اس مجموعہ کی ابتدا ہو۔ مرحوم کی اسی ہدایت کے مدِ نظر تاریخ کے حساب سے غزلوں کو ترتیب دیا گیا ہے اور سن ۱۹۴۲ء کی غزل پر غیر مطبوعہ غزلوں کے حصہ کا اختتام کیا گیا ہے۔

نشور صاحب کے مجموعہ کلام "آتش و نم" اور "عکسِ محکم" کو چھوڑ کر ان کا اور کوئی مجموعہ فی الوقت دستیاب نہیں ہے، اس لئے اہلِ ذوق کی فرمائشوں کے پیشِ نظر کچھ مشہور غزلوں کو جن کی فرمائش ہوتی رہتی ہے اس مجموعہ کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔

اِس مجموعہ میں نشور صاحب کی شخصیت اور فن پر بھی کچھ اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں جس سے اس مجموعہ کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اُمید ہے کہ ادبی حلقوں میں ہماری اس کوشش کو سراہا جائے گا۔

مومنہ نشور واحدی

ناشر

۲۹ر نومبر ۱۹۹۹ء۔ ناظر باغ

کان پور

نیاز واحدی

مرتب

نشورؔ واحدی

کی

شخصیت اور فن پر

اہلِ قلم کے مضامین
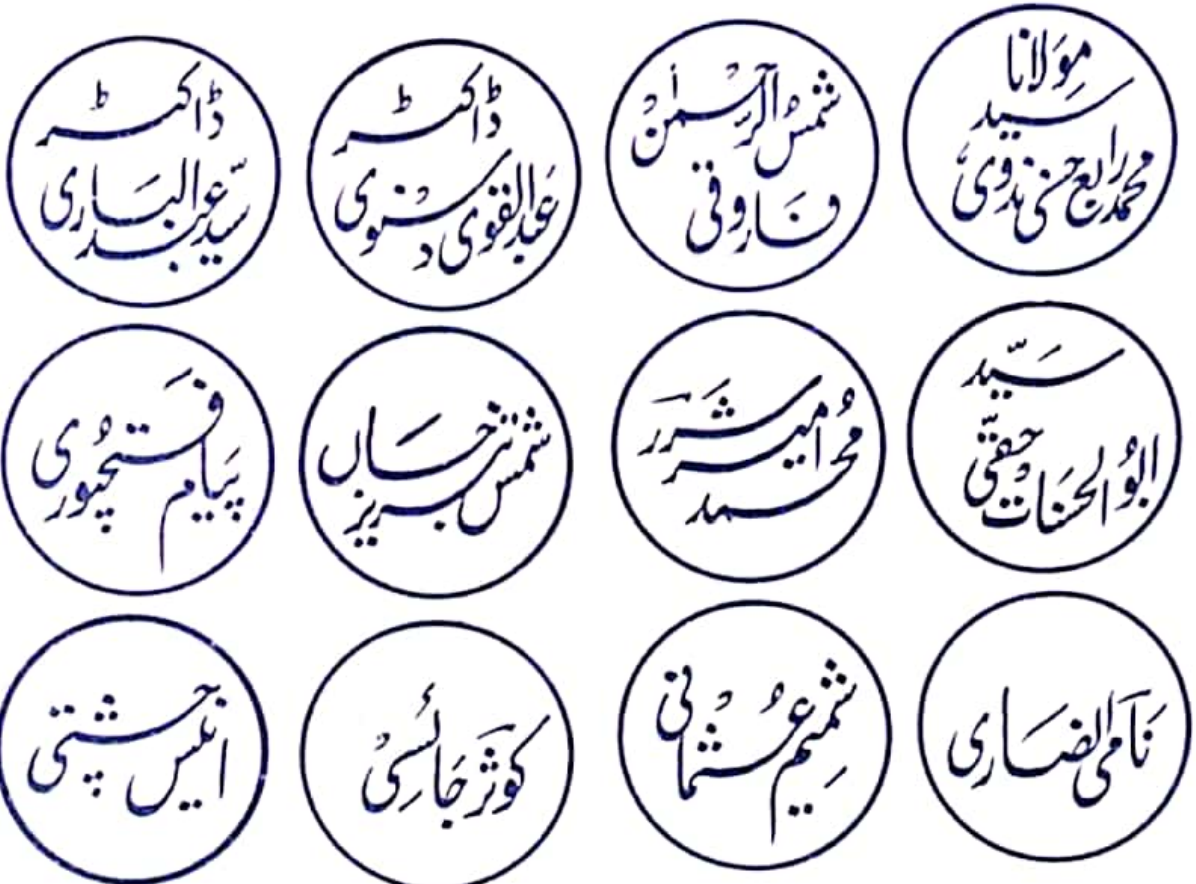
مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

شمس الرحمٰن فاروقی

ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی

ڈاکٹر سید عبدالباری

سید ابوالحسنات حقی

محمد امیر شرر

شمس تبریز خاں

پیام فتحپوری

نامی انصاری

شمیم عثمانی

کوثر جائسی

انیس چشتی

سُن کے اشعارِ نشورؔ اے دوست تنقیدیں نہ کر
گرتے دریا میں یہ ظالم آبشاروں کو نہ چھیڑ

سید محمد رابع حسنی ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تبرکات

نشور واحدی صاحب، اپنے عہد کے عظیم اور مایہ ناز شاعروں میں گزرے ہیں، ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ حسن و عشق کی خوش بیانی، زندگی کے راحت و غم کی ترجمانی، تصوف و فکرِ بلند کا اظہار پُراثر انداز میں، ان کے شعری پیکر میں جھلکتا نظر آتا ہے، اُنھوں نے غزل کو ایک نیا رنگ عطا کیا اور اس راہ میں اپنی ایک منفرد جگہ بنائی، خود ان کی زبانی سُنئے:

فکر میں وُسعت ہو اور گہرا ہو کچھ رنگِ غزل
جانتے ہیں سب نشورؔ اس طرز کا بانی مجھے

اور کہتے ہیں:

اِک وَجد ٹپکتا ہے ہر لفظِ محبت سے!
ہے شعرِ نشورؔ آخر کس حُسن کا افسانہ
مُطرب بہ لبِ لعلیں، ساقی بہ مئے و مینا
اس گرمیٔ محفل میں ایمان پگھلتا ہے

عشق اِک ربطِ سادہ ہوتا ہے
محشرِ بے ارادہ ہوتا ہے

نظر نظر کو ساقی حیات کہتے آئے ہیں
ان انکھڑیوں کو میکدہ کی رات کہتے آئے ہیں

مضمون آفرینی و دلنواز اسلوب انکی شاعری کی خصوصیات میں تھا، وہ ان شاعروں میں تھے جن کے یہاں جدت اور آمد تھی اور جب شاعر کے یہاں آمد ہو تو شاعر کو محنت نہیں کرنا پڑتی، ایسے لمحات کی شاعری ایک طرح سے الہامی شاعری بن جاتی ہے اور شاعر تاریخ میں اپنا مقام بنا جاتا ہے۔

نشور صاحب کا تعلیمی آغاز دینی ماحول و عربی مدرسے سے ہوا جس کے اثر سے وہ عربی سے واقفیت اور دین سے وابستگی کے ساتھ ملت کے درد کے بھی حامل تھے جس کی جھلکیاں، ان کے احساس دینی و غیرت ملی اور مدح خیر الانامؐ میں صاف نظر آتی ہے اُن کی نعت تو نعتیہ شاعری میں ایک خاصے کا درجہ رکھتی ہے، ان کی نعت کا آغاز دیکھئے، کہتے ہیں :

ذکر اس کا ہے اور با چشمِ پُر نم — نازاں ہے جس پر تاریخ آدمؑ
ایمانِ مطلق ارشادِ محکم — نورِ مجسم جانِ دو عالم
رُوحِ ہدایت احمدؐ بنامے — یثرب مقامے بطحا خرامے

اور ۱۹۴۷ء کا پُر آشوب زمانہ جس میں ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو اپنے سجائے اور بنائے ہوئے ملک میں، اپنے حقِ وطنی سے محرومی کا مشاہدہ کرنا پڑ رہا تھا، نشور صاحب نے اس کو خوب محسوس کیا، ان کا یہ احساس، ان کے شعروں میں ڈھلا ہے، وہ کہتے ہیں :

اک کشمکشِ غم ہے اور شوق کی منزل ہے ✤ دامن بھی بچانا ہے شعلہ بھی مقابل ہے

کتنے بادل بکھر گئے اور کتنی برکھا سوکھ گئی!
دُنیا ہے وہ ریت کا رستہ ساون بھادوں پیاسا جائے!

کبھی جھوٹے سہارے غم میں راس آیا نہیں کرتے ✤ یہ بادل اُڑ کے آتے ہیں مگر سایہ نہیں کرتے

نشورؔ صاحب کے یہاں پڑھنے کا انداز بھی بڑا دلنواز تھا، ان کے اشعار جب خود ان کی زبان سے سُنے جاتے تو بڑی دلنوازی کا باعث ہوتے تھے، ان کے کلام پر مشتمل کئی دیوان شائع ہو چکے ہیں، اور قارئین و شائقین سے دادِ تحسین لے چکے ہیں۔

نشورؔ صاحب مرحوم کا ان کے ادبی مقام کی بنا پر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ سے بھی قدر شناسی کا ربط و تعلق رہا، وہ کئی بار مولانا کے پاس ندوہ تشریف لائے اور اظہارِ تعلق کیا۔ مولانا مدظلہٗ بھی ان کی شاعری کو پسند کرتے اور ان سے سنتے اور کلام کی خوبی کے لحاظ سے اس کی داد دیتے تھے، ان سے نشورؔ صاحب کے اس ربط نے ہم لوگوں کو ان سے مزید قریب کر دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادہ نیاز واحدی صاحب سے ربط رہا۔ خاص طور پر ان کے برادرِ نسبتی ڈاکٹر سید لقمان اعظمی ندوی سے ہمارے تعلق نے اس ربط کو بڑھایا، اور نیاز صاحب بھی تعلقِ خاطر سے معاملہ کرتے رہے۔

نیاز صاحب کو اپنے والد صاحب کے کلام کو شائع کرنے اور دلچسپی لینے کی فکر رہی ہے اس فکر کے نتیجہ میں انھوں نے، اپنے والد صاحب کے ایسے کلام کو جو ان کے پاس محفوظ نہیں رہ سکا تھا، اخبارات و رسائل میں تلاش کر کے اور اپنے دوستوں کے ذریعہ حاصل کر کے جمع کیا ہے، جو یوں تو نیا کلام نہیں ہے لیکن وہ اپنی دریافت کے لحاظ سے نیا ہے۔ اس کو اصحابِ ذوق اور نشورؔ صاحب کی شاعری کے قدر دانوں کو پیش کر رہے ہیں اس طرح

ایک بڑے شاعر کے صاحبِ ذوق فرزند ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔

انھوں نے اپنے والد مرحوم سے میری محبّت دیکھ کر مجھ سے فرمائش کی کہ میں چند سطریں اس دیوان کی تمہید و تعارف میں لکھ دوں، اگرچہ میں شعری کوچہ کا راہرو نہیں ہوں لیکن ان کی محبّت کی قدردانی میں یہ چند سطریں پیش کر رہا ہوں، اُمید کرتا ہوں کہ نشور صاحب کا یہ شعری مجموعہ پوری قدر و ذوق سے پڑھا جائے گا۔

سیّد محمد رابع حسنی ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

لکھنؤ
۳ ستمبر ۱۹۹۹ء

شمس الرحمن فاروقی
(انگریزی سے ترجمہ)

نشور۔ تغزل کی سنہری آواز

میرے ادبی نہاں خانہ یادداشت میں نشور واحدی سے متعلق یادداشت اولین حیثیت کی حامل ہے ۱۹۴۲ء میں جب میں مشکل سے سات سال کا تھا، اپنے ایک ہمسایہ نوجوان کی پرجذب آواز سے جاگ جایا کرتا تھا، جو جوانی کی تنہا راتوں کو علامہ نشور واحدی کی شیریں و مترنم غزلیں گاکر کاٹ دیا کرتا تھا۔ ان دنوں میرا قیام اعظم گڑھ میں تھا، اور تعلیم کا سلسلہ بھی شروع نہ ہوا تھا۔ اعظم گڑھ میں میری طفولیت کے وہ ایام بے پناہ شوق و جذبۂ شاعری سے ہم آہنگ تھے۔ کم از کم سال میں ایک سے زائد شاعروں کا اجتماع عمل میں آتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے اجتماعات عام تھے جن میں اکثر بیرونی شعرا شرکت کرتے۔ جگر و اصغر کے احباب و حامیان مولانا اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد اس ادبی جماعت کے روح رواں تھے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مہتمم دارالمصنفین کی شاندار سالانہ ضیافتوں میں میں بھی اپنے والد کے ساتھ شرکت کرتا۔

ان دنوں شعر و شاعری نے عوام کی موضوعہ ناشائستہ علامت اختیار نہ کی تھی۔ نیم تعلیم یافتہ لوگوں کے برخلاف جو مشاعرہ کو قوالی کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ عوام ان دنوں بہت منضبط اور شعر و شاعری کے واقعی دلدادہ ہوا کرتے تھے۔ وہ مشاعروں میں اچھی غزلوں کی سماعت کیلئے بڑی بے صبری سے انتظار کرتے اور دو دو تین تین دن شرکت کرتے۔

نیز دریں اثنا ناموزوں غزلوں کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ شعرا کو کامیابی اور عزت کے حصول کیلئے ایک طویل صبر آزما دور سے گذرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ ترنم نے شاعری کی کامیابی میں تعاون کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم یہ شاعر کی عظمت کی کوئی خاص کسوٹی نہ تھی جیسا کہ فی زمانہ ہوگیا ہے۔

انھیں دنوں کی بات ہے کہ نشور واحدی بحیثیت ایک جدید وا ہم شاعر کے میرے ذہن و شعور پر چھا گئے۔ میری عمر کا تقاضا ابھی یہ نہ تھا کہ ان امور کو کماحقہ سمجھ سکتا۔ غالب و اقبال کے کلام سے ہم آہنگ ہمارے نوخیز احساسات کے لیے نشور کے اشعار میں مضمر ایک خاموش قوت، حیرت انگیز طور پر موافق ثابت ہوئی۔

نشور کی شاعری سے دیرینہ تعلق کے باوجود بھی ان کو کسی عصری پیغام سے وابستہ کرنے میں مشکل محسوس کرتا ہوں۔ ترقی پسند تحریک جس نے لاالعینیت، رسمی پابندی اور لوبہ لو تجربات سے فرار کی بنیادیں ہلادیں، اب ختم ہو چلی ہے۔ ترقی پسند شاعر کو ایک ایسی شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں جو انقلابی اور معاشرتی عناصر سے ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے اسلاف کے موضوعہ اسلوب شاعری کو لایعنی اور بے کار کہہ کر رد کر دیا۔ اور غزل کے اس مقبول عام پیکر کو مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جو شاعر کے جذبات اور داخلی کیفیات کا آئینہ دار تھا۔ محبت اور بالخصوص غیر معیاری، ناموزوں اور اخلاق سوز و ناشائستہ محبت جسکو اختیار کر کے شاعر خود کو دائمی طور پر الم زدہ اور تمام اخلاقی قیود سے مبرا تصور کرتا ہے۔ اب ہماری شاعری کا موضوع نہیں رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر ہمارے شعرا کے ایک بڑے طبقے نے محسوس کر لیا کہ اگر ہماری شاعری کو اپنا روایتی انداز

برقرار رکھنا ہے تو اسکے دائرہ کو وسیع ہونا چاہئے۔

ایسے شعراء کے زمرے میں علاّمہ نشورؔ واحدی کا نام ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ انکا کلام جدید نقطۂ نگاہ سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ بدلتے زمانہ کے احساس سے پیدا شدہ جدید حساسیت سے بھی ممتاز ہے۔ ابتداء میں انھوں نے ریاضؔ اور دوسرے ایسے شعراء کا تتبع کیا جو شاعری کو اظہار لیاقت کے ایک ذریعہ کے علاوہ اور کچھ نہ سمجھتے تھے۔ ان کی غزلیں بھی شراب و محبوب کی روایتی اور شوخ حکایتوں نیز مذہبی نقطۂ نظر کے برخلاف واعظ و محاسب پر تیکھے طنز سے بھری ہوتی تھیں۔ ایک اُردو شاعر کے لیے شعر و شاعری کے نتیجہ میں، صدیوں سے جمع روایتی شاعرانہ موضوعات، تشبیہات و استعارات کے خزانہ سے مستفید ہونا بہت آسان ہے۔

علاّمہ نشورؔ واحدی کی جیسے جیسے نشو و نما ہوتی گئی وہ روایتی اور مروّجہ اسلوب سے گریز اور زندگی کی صداقتوں کے شخصی تجربہ پر بیش از بیش اعتماد کرتے رہے۔ یہاں شخصی صداقت اور صداقتوں کے شخصی تجربہ میں تمیز کرنا ضروری ہے۔ نشورؔ شخصی صداقتوں سے آگے نہیں جاتے۔ علاّمہ نشورؔ واحدی کسی نوری اور خیرہ کن کشف سے متمتع الہامی شاعر نہیں ہیں۔ یہ کسی قدر معتدل نقطۂ نگاہ ہے۔ انکی پرواز بہت بلند نہیں لیکن مستقل ہے۔ اس حیثیت سے وہ ہمیں اصغرؔ گونڈوی کی یاد دلاتے ہیں۔ اصغرؔ کی خاص خصوصیت ایک بے داغ و مختلف کائنات ہے۔ جس کا خاص سبب مراقبۂ نفس ہے نہ کہ عالم خارجی کے بارے میں معلومات کا فقدان۔ اصغرؔ کے عالم میں کوئی پیچیدگی نہیں اور نہ ہی نشورؔ کے عالم میں۔ باوجودیکہ اس میں زندگی کے لازوال حقائق کا ایک سادہ احساس ہے۔

نشورؔ کی غزلیات میں انسان ناگزیر طور پر محبوب ہے، بلکہ غالبؔ کی مغرورانہ فرار کے بجائے ان میں عرفانِ نفس کی جانب پیش قدمی ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں ؎

ازبساطِ حیات بھی دیکھا ایک محفل ہزار تنہائی
زندگی ایک ہجومِ گزراں ہے لیکن آدمی اپنی جگہ عالمِ صد تنہائی

نشورؔ کا احساسِ خودی انکے صداقتِ حسن کے تجربہ سے عبارت ہے۔ خالص مادی حسن سے گریز کرکے جو اکثر گمراہ کن ہوتا ہے وہ ایک ایسے مقام پر پہونچ گئے جہاں ان کا احساسِ خودی جو حزن وملال کا رنگ لیے ہوئے ہے مرکوزِ نظر ہو گیا ہے ؎

ہے شام ابھی کیا ہے بہکی ہوئی باتیں ہیں کچھ رات ڈھلے ساقی میخانہ سنبھلتا ہے
پیراہنِ رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے معصوم ہے کیا جانے دامن کہیں جلتا ہے

حزن وملال کا رنگ اظہار کی بے بضاعتی کے سبب نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب زمانہ کی ناموافقت ہے جو مسلسل تبدیل پذیر ہے۔ اور آخر کار ہر چیز کو فنا کر دیتی ہے۔ یہ خیال کہ وقت شکست وریخت اور انقلاب کا ایک آلہ ہے کوئی نیا نہیں ہے۔ جو چیز نئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو شخصی طور پر محسوس کیا گیا ہے روایتی سطح پر نہیں۔ جیسا کہ سوئن برن (Swinburne) کہتا ہے کہ "وقت کے پاس آنسوؤں کا تحفہ ہے،" اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ انگریزی شعراء میں سوئن برن ہی ہے جس کی اکثر یاد نشورؔ واحدی مجھے دلاتے ہیں۔ وہ زبان کے لحنی امکانات پر ایسی ہی گرفت رکھتے ہیں جیسا کہ سوئن برن۔

نشورؔ کی غزلوں سے جو شبیہ انکی سامنے آتی ہے وہ غور وفکر میں ڈوبے ہوئے ایسے صوفی منش انسان کی ہے جو الفاظ کی موسیقی سے سرشار ہے۔ یہ موسیقی کچھ اس طرح کی واقع

ہوتی ہے کہ اکثر ہماری توجہات کو شعر کے اصلی مفہوم سے ہٹا دیتی ہے۔ اکثر حالات میں موسیقی خود ایک مفہوم ہے۔

نشورؔ نے اکثر اصلیت پر مبنی اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ وہ ایک ممتاز و نمایاں انداز غزل خوانی کے بھی موجد ہیں جس کو کم وبیش کامیابی کے ساتھ ہمارے نوجوان شعراء نے اختیار کیا ہے۔

گذشتہ ۳۰۔ ۴۰ سال میں بیشمار غزل گویوں کی جماعت میں نشورؔ کا مقام نمایاں و ممتاز رہا ہے نیز وہ ایک طرز خاص کے موجد بھی ہیں۔

▪▪

جشن نشورؔ سوینیر الٰہ آباد۔ سے ماخوذ
بشکریہ
شاہ آفتاب احمد
الٰہ آباد

عبدالقوی دسنوی

نشور واحدی
ایک منفرد غزل گو

اُردو کے مشہور و معروف، مقبول اور محترم شاعر، نشور واحدی نے اپنی حیات میں اپنے کلام سے، ایک عالم کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں نہ صرف کامیابی حاصل کی تھی بلکہ انھیں اپنا قدر داں اور گرویدہ اس حد تک بنا دیا تھا کہ عام طور سے لوگ اُن کا کلام پڑھنے اور سُننے میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ جب بھی کسی آل انڈیا مشاعرے میں اُن کے آنے کا اعلان ہوتا تو لوگ عام طور سے، اُن کے کلام سے محظوظ ہونے کیلئے کشاں کشاں مشاعرہ گاہ میں پہنچتے تھے، اور مشاعرہ کے بعد کئی روز تک اُن کا اور اُن کے کلام کا ذکر کرتے نظر آتے تھے۔ دراصل یہ مقبولیت انہیں اس لئے حاصل ہوئی تھی کہ وہ اچھے شاعر تھے، معتبر شاعر تھے، محترم غزل گو تھے، ماضی سے جُڑے ہوئے حال کے ترجمان تھے۔

نشور واحدی کی شاعری کی ابتداء نظم گوئی سے ہوئی یا غزل گوئی سے بلاشبہ وہ ایک اچھے نظم گو بھی تھے اور بلند پایہ غزل گو بھی۔

ان کی شاعری کی زبان نہایت شستہ اور شگفتہ ہے۔ چونکہ وہ غزل فارسی میں بڑی اچھی صلاحیت کے مالک تھے اس لئے ان زبانوں کا اثر بھی ان کے کلام پر نمایاں ہے۔ شوکتِ الفاظ نئی نئی ترکیبوں اور استعاروں نے ان کے کلام میں ایک خاص کیفیت اور نفاست پیدا کر دی ہے ان کی نظموں میں فکر و فلسفہ بھی ہے، شب و روز کے تجربات اور سچائیاں بھی ہیں بلکہ

قوم سے محبت بھی ہے، مذہب سے گہری وابستگی بھی ہے اور زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کی آرزو بھی ہے جو اُن کی نظمیں پڑھنے والوں پر دیر تک کے لئے اپنا اثر چھوڑتی ہیں اور یہی حال ان کی غزلوں کا ہے نظموں کی طرح ان کی غزلیں بھی خوب ہیں، جن میں نشورؔ واحدی کے مزاج کی انفرادیت نمایاں نظر آتی ہے، جس کی وجہ سے اُن کی غزلیں اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہیں ۔

بلاشبہ ان کی غزلیں حسن و عشق کے جذبات کی ترجمان ہیں لیکن ان کے اظہار میں نہایت پاکیزگی اور سادگی ہے، وہ سطحیت اور غیر فطری باتوں کو کہیں بھی آنے نہیں دیتے۔ سستی جذباتیت کی بھی ان کے کلام میں گنجائش نہیں ہے، البتہ غمِ دوراں کا اظہار بھی جگہ جگہ ان کی غزلوں میں ملتا ہے، جس کی وجہ سے دُنیا، دُنیا کے لوگ اور ان کے اچھے بُرے تجربات سے ان کے کلام کے ذریعہ بار بار آگاہی ہوتی ہے۔ اُن میں عارفانہ خیالات کا اظہار بھی کیا گیا ہے، شراب و سرمستی بھی ملتی ہے لیکن اُن کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر جگہ توازن ہے اور ایک اچھی زندگی گذارنے کا حوصلہ اور سلیقہ ملتا ہے، ان کی غزلوں کے یہ اشعار ملاحظہ کریں۔ محبوب کی باتیں کرتے ہیں لیکن کس ادا کے ساتھ :

نگاہ چار ہوئی اور جھک گئیں نظریں ؎ شباب مائلِ طرزِ سلام ہوتا ہے

کسی کی یاد مصیبت کی یاد ہوتی ہے ؎ کسی کا نام قیامت کا نام ہوتا ہے

جھکی جھکی ہوئی نظریں کھنچے کھنچے ہوئے خود ؎ اک التفات بقصدِ اجتناب ہوتا ہے

اُدھر کر رہے ہیں نظر نیچی نیچی ؎ ادھر ٹکڑے ٹکڑے جگر کرنے والے

انہیں کیا خبر ہے شبِ ہجر کیا ہے ؎ اسے جانتے ہیں سحر کرنے والے

زُلفِ دراز پرشکن دوش سے تا کمر بھی ہے ؎ مستِ خرام ناز کا حُسن شباب پر بھی ہے

شرم کی چلمنیں بھی ہیں جلوہ قریب در بھی ہے ؎ پردہ بہ پردہ حُسن کو آرزوئے نظر بھی ہے

کوئی آئے تو اپنے میں جاناسمٹ ÷ کوئی جائے تو مڑکر ادھر دیکھنا

کبھی عتاب، کبھی انفعال کیا کہنا ÷ حیا و ناز کی دلکش مثال کیا کہنا

وہ دونوں سمت نگاہیں جھکی جھکی رہنا ÷ وہ جاں بہ بے اخفائے حال کیا کہنا

گزرا مرے قریب سے اک پیکرِ شباب ÷ نیچی نظر میں حشر کا ساماں لئے ہوئے

حقیقت حسن جگہ ہوتی ہے نابانی بتاتی ہے ÷ کوئی پردے میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے

یَں دامن تھامتا ہوں اور ادا دامن چھڑاتی ہے ÷ محبت ہے تو کچھ بیگانگی بھی پائی جاتی ہے

تم کیا گئے کہ جیسے دنیا بدل گئی ہے ÷ سورج وہی ہے لیکن رونق نہیں سحر میں

یہ نشور واحدی کی غزلوں کے وہ اشعار ہیں جن میں محبوب کے انداز و ادا، شرم و حیا، حسن و جمال جذبات و احساس کی سچی تصویر نظر آتی ہیں، ہر تصویر بولتی ہوئی محبت کی کہانی سناتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جن میں ہمارے معاشرے کی جھلک بھی ملتی ہے۔ یہ ساری تصویریں سادگی کی مظہر ہیں جو سیدھے سادے الفاظ کے ذریعہ پیش کی گئی ہیں جو نشور صاحب کی فن کاری کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

ان کے یہاں محبوب کے حسن کا عالم یہ ہے:

منھ چھپالے تو مرا جوشِ تمنا بیتاب ÷ سامنے آئے تو جلوہ کرے مدہوش مجھے

جنوں نہیں وہ کہ اگر آنکھ برابر ہو جائے ÷ اک زمانے کا زمانہ تہِ خنجر ہو جائے

محبوب کے سلسلے میں نشور واحدی یہ بھی کہتے ہیں:

حسن کے ساتھ کچھ حجاب نہ ہو ÷ آئینہ کیا وہ جس میں آب نہ ہو

اور عشقِ محبوب کا یہ عالم بھی نظر آتا ہے:

ہیں عالم اور عالم کے تماشے بھول بیٹھا ہوں ÷ نہیں تم رہ گئے ہو میرے دل میں دلنشیں ہو کر

شرابِ محبت کی بدمستی انہیں کوچۂ خمریات تک پہنچا دیتی ہے اور وہ یہ کہتے ہوئے ملتے ہیں:

خبر کیا تھی کہ واعظ ہے یہی سمجھا کہ ساقی ہے ✿ اُٹھا اور اُٹھ کے جا لپٹا میں بیتابانہ مستی میں
قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں جا کر ✿ نشورؔ اس وقت ہوں کچھ ہوش سے بیگانہ مستی میں

پلا پلا کہ یہ جہاں رہے نہ رہے ✿ بہارِ حُسنِ گل و گلستاں رہے نہ رہے

اور یہ بھی سچ ہے کہ کوچۂ خمریات سے مدہوشی کے باوجود وہ سنبھل سنبھل کر گزرے، اور اس وادی میں زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور ہمیشہ ہوش کا دامن تھامے رہے:

لیکن نشورؔ واحدی کی غزلیں حُسن و عشق اور خمریات ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ دُنیا اور اس کے لوگوں کے تجربے، ان کے رویے، ایک دوسرے کے ساتھ ان کے سلوک وغیرہ کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں جن کی جھلکیاں مطالعے کے دوران سامنے آتی ہیں اور ہمیں بہت کچھ بتا جاتی ہیں، وہ دُنیا کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں:

نشورؔ اس وقت بھی دُنیا اسیرِ ملک و ملّت ہے ✿ ابھی فکر و نظر تا حدِ انسانی نہیں جاتی

یا

سحاب و سیل دھو سکتے نہیں گردِ فلاکت کو ✿ بہار آئی مگر دُنیا کی ویرانی نہیں جاتی
جدھر دیکھا نشورؔ اک عالمِ دیگر نظر آیا ✿ مُصیبت میں یہ دُنیا اجنبی معلوم ہوتی ہے

یہ دُنیا کیا ہے؟ اس سے اس طرح آگاہ کرتے ہیں:

ویراں بھی ہے رنگیں بھی ہے دُنیا بھی عجب اک رستہ ہے
یاں چوٹ لگی ہے پھُولوں سے یاں زخم بھرے ہیں خاروں سے

اُن کی دُور بین نگاہیں یہ بھی دیکھ لیتی ہیں:

غریبوں کے لہو سے اس طرح سونا بناتے ہیں ✿ یہ جنگِ عصر، جنگِ زرگری معلوم ہوتی ہے

اسی تجربہ کے تحت نشورؔ واحدی نے دُنیا کی اس سچائی پر سے بھی پردہ اُٹھایا ہے جس کی طرف عام

لوگوں کی توجہ بہیں ہے:

نئی دُنیا مجسّم دِل کشی معلوم ہوتی ہے
مگر اس حُسن میں دل کی کمی معلوم ہوتی ہے

انھوں نے سیاسی دُنیا کی بات بھی نہایت اعتماد کے ساتھ اس طرح کی ہے:

کرسی وزارتوں کی ہے چڑھتا ہُوا نشہ ؛ ایسے میں گرتے گرتے سنبھلنا ہے آپ کو

اور اس بات سے بھی باخبر کرتے ہیں:

کہیں اک نفس کی قیمت ہے ہزار زخم کاری ؛ کہیں مفت بٹ رہی ہے یہ متاعِ زندگانی

یا کس بے بسی کے ساتھ بسر کر رہا ہے عُمر ؛ اِنسان مشتِ خاک کا احساں لئے ہُوئے

نشورؔ واحدی اس دُنیا کے لوگوں سے بھی مختلف انداز سے مختلف تجربوں کی روشنی میں مِلاتے ہیں اور بتاتے ہیں:

نظر پھیرے ہوئے مِلتا ہے رستے کا ہر اک ساتھی ؛ جسے ہم دوست سمجھے تھے نظر دُزدیدہ ہے وہ بھی

اور اپنی اس حالت سے بھی آگاہ کرتے ہیں:

سحر اور شام سے کچھ یوں گزرتا جا رہا ہوں میں ؛ کہ جیتا جا رہا ہوں اور مرتا جا رہا ہوں میں

اور یہ بھی کہتے ہیں:

وہ انساں کیا جو بیگانہ ہو ذوقِ زخم و خنجر سے ؛ وہ میکش کیا جسے صہبا کی تلخی ناگوار آئے

اور انقلابِ زمانہ سے یہ کہہ دے کوئی ؛ پیکرِ شوق ہوں مِٹنا نہیں آساں میرا

اسی کے ساتھ ہمیں جینے کا سلیقہ بھی بتاتے ہیں:

پلکوں کے نرم سائے میں پلنا ہے آپ کو ؛ اور زندگی کی دُھوپ میں چلنا ہے آپ کو

ان کا یہ کہنا کس قدر حقیقت سے قریب ہے:

جو سماج آج ہے کل نہ تھا، جو مزاج کل تھا وہ اب نہیں
کسی اک نظامِ حیات کو جو ثبات ہو تو بتائیے!

زندگی سے متعلق یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے اور اس کے راز کو سمجھنے کی کوشش کیجئے:

سحر اور شام یوں ہی زندگانی ہوتی جاتی ہے ؛ زمانہ بیتا جاتا ہے کہانی ہوتی جاتی ہے

ان کا یہ تجربہ بھی ہمیں بہت کچھ بتا رہا ہے:

نشور اب اور ہی صورت ہو جینے کی تو بہتر ہے ؛ نئی دنیا بھی نظروں میں پرانی ہوتی جاتی ہے

ایک شعر میں جینے مرنے سے متعلق بڑی سادگی کے ساتھ بہت کچھ کہہ گئے ہیں:

مرنا بھی آساں جینا بھی آساں ؛ ہمت نہ ہو تو ہر کام مشکل

یہاں چند شعر اور پیش کرتا ہوں جن سے ان کے صحت مند اندازِ فکر سے آگاہی ہوتی ہے اور اُن کی عظمت کا معترف ہونا پڑتا ہے:

ابھی ہندوستان میں انقلاب آیا ہے ایسا ہی ؛ کوئی بہرِ دعا جیسے سرِ لوحِ مزار آئے

یا

بڑی حسرت سے انساں بچپنے کو یاد کرتا ہے ؛ یہ پھل پک کر دوبارہ چاہتا ہے خام ہو جائے

یا اب تک ہے بزمِ غیر میں جس کی روشنی ؛ کچھ لوگ تھے کہ شمعِ محبت جلا گئے

یا اُڑا کر لے گیا عکسِ رُخِ ساقی وہاں مجھکو ؛ بلا لوٹا ہوا آئینہ ہستی جہاں مجھکو

مسلسل شامِ غربت شامِ فرقت شامِ بیماری ؛ مرا دل کانپ جاتا ہے جو لفظِ شام آتا ہے

یا خود بخود کھلنے لگے دانائی تو کے فریب ؛ جلد ہی ہونے لگا احساسِ نادانی مجھے

نشور واحدی نے اپنی غزل کے بارے میں صحیح کہا ہے:

نشورؔ واحدی کی بھی غزل کیا خوب ہوتی ہے
تخیّل پاکبازانہ مگر انداز رندانہ

نشورؔ واحدی کی غزلیں بلاشبہ زندگی سے بھرپور، پاکیزہ خیالات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ زبان، بیان، انداز، افکار، تجربات، جو اُن کے اپنے ہیں اور ان کے اپنے انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اپنا ایک خاص مزاج، کیفیت اور اثر و تاثیر رکھتے ہیں جن کے مطالعہ سے ایک نئی فضا میں ہم سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور جس کا اثر دیر تک قائم رہتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ "اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک" کو اہلِ اُردو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، اس کی غزلوں سے لُطف اندوز بھی ہوں گے اور نشورؔ واحدی کی عظمت کے اور زیادہ معترف ہوں گے۔ ••

ڈاکٹر عبد القوی دسنوی
۲۔ پرنس کالونی
عیدگاہ ہلس، بھوپال

۴ ردسمبر ۱۹۹۸ء

ڈاکٹر سید عبدالباری

نشور واحدی
اُردو غزل کا ایک منفرد فنکار

تقسیم ہند کے وقت ہندوستان میں اردو بولنے پڑھنے اور اس سے عشق کرنے والے بڑے بوڑھے تشویش اور اندیشوں کے غبار میں گم تھے اور انھیں اندازہ نہ تھا کہ آئندہ اُردو کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا لیکن ہم نوعمر طلبہ اس عہد میں اس زبان کے بیشمار شاعروں اور فنکاروں کے چہچہوں سے گونجتی ہوئی فضائے گلشنِ وطن میں سرمست و بےخود سے ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ مشاعرے، جگہ جگہ ادبی محفلیں، بےشمار دلکش و رنگین اُردو رسائل اور نئے نئے شعری مجموعے چھوٹے چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ترقی پسندوں میں مجروح، فیض، جذبی و مجاز اور اقبال کی روایات فکر و تخلیق کو تسلسل عطا کرنے والوں میں جگر، شفیق، روش اور نشور اس عہد میں عام طور پر نوجوانوں کے مذاقِ سخن پر چھائے ہوئے تھے۔ فراق و جوش کے اشعار اور ان کے گرد چکر لگانے والے بےشمار سیارگانِ سخن سے محظوظ ہونے والے یہ نہ محسوس کرتے تھے کہ کبھی وہ دن بھی آسکتا ہے کہ سیاسی انقلابات کے سبب ادب و شعر کے یہ بیشمار چشمے خشک ہونے لگیں گے۔ میں ثانوی تعلیم کے مراحل سے گذر رہا تھا کہ ۱۹۵۰ء و ۱۹۶۰ء کے درمیان قصبہ ٹانڈہ (فیض آباد) میں مسلم نسواں اسکول کی امداد کیلئے ہونے والے سالانہ مشاعروں

میں کئی بار حضرتِ نشور تشریف لائے جہاں اس شیدائی نشور کو انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کی وہ معروف غزلیں جو عوام و خواص کی زبان پر تھیں خود ان سے سُننے کا موقع ملا۔ ان کے اندر یہ بات میرے لئے خاص طور پر باعثِ کشش تھی کہ وہ اور شاعروں سے بالکل الگ تھلگ ایک صوفی صافی انسان اور اپنی تہذیب و روایت کے پاسدار ایک دردمند فنکار نظر آتے۔ آزادی کے بعد جب لوگ ملک سے خوف و ہراس کے عالم میں نقلِ وطن کر رہے تھے اور اپنی اقتدار و تمدّنی مظاہر کے تحفّظ کے بارے میں طرح طرح کے اندیشوں کے شکار تھے اور یہ صدائیں بلند کی جا رہی تھیں کہ اُردو اور اس کے بولنے والے اس زمین کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں ہمارے دیدہ وَر اور عالی ہمّت فنکاروں نے خودی و خود اعتمادی کا ولولہ انگیز پیغام دیا۔ حضرت جگر شفیق کے بیدار کُن نغموں کے ساتھ حضرت نشور کی نوائے سینہ تاب بھی فضا میں گونجنے لگی۔ ریڈیو سے اور شاعروں میں ان کی یہ غزل سُن کر نہ جانے کتنے انسانوں کی شریانوں میں لہو کی رفتار تیز ہو گئی ؎

ہر ذرّۂ حنا کی کو کرن ہم نے بنایا　　مٹّی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

اَغیار کو گُل پیرہنی ہم نے عطا کی　　اپنے لیے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

ہر جذبۂ آزادیِ فطرت کو ہوا دی　　ہر بادۂ پیمانہ شکن ہم نے بنایا

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دَور خرد میں　　اِک سلسلۂ دار و رَسَن ہم نے بنایا

مستقبلِ تہذیب کا نغمہ وہی ٹھہرا　　جو زمزمۂ گنگ و جمن ہم نے بنایا

نشور جب اس انداز سے نغمہ سرا ہوتے تو ان کے مُنھ سے پھول جھڑتے ہوئے محسوس ہوتے اور یہ یقین ہونے لگتا کہ غزل ہماری تہذیب کا واقعی بیش قیمت سرمایہ ہے۔ سامعین

محوِ حیرت ہوتے کہ غزل نشورؔ کی شخصیت کے سانچے میں ڈھل گئی ہے یا خود حضرت نشورؔ غزل کے شیشے میں اتر آئے ہیں۔ اس زمانہ میں جب کہ کوہ پیکر نظم نگاروں کی قاہری، سطوت اور گھن گرج کے سامنے غزل کا ساز شکستہ اور اس کی لَے مدّھم و بے کیف ہونے کا اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا نشورؔ نے اقبالؔ و جگرؔ اور شفیقؔ اور ترقی پسند شعراء میں مجروحؔ، فیضؔ اور جذبیؔ کی طرح غزل کی عظمت اور اسکی مقبولیت کا پرچم بلند رکھا۔ ان سب شاعروں سے الگ نشورؔ کا تغزّل اپنی ایک انفرادیت اور اپنا ایک امتیاز رکھتا تھا۔ انکی موسیقیت ان کے لحن سے زیادہ ان کی آرزومندی، ان کی ولولہ انگیزی اور ہماری تصوّف و عشق کی تابندہ روایات سے ان کا والہانہ تعلّق ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا اور اپنے اندر جذب کر لیتا تھا۔ ان کے بعض اشعار تو دِل پر بجلی بن کر گرتے اور ہماری تاریخ کے بعض روشن اوراق ہمارے پردۂ تصوّر پر کوندجاتے اور ان درویش صفت حکمرانوں کا چہرہ سامنے آجاتا جو رعایا کی خبر گیری کیلئے راتوں کو گشت کرتے تھے ؎

اِک سحر شبستاں ہے یہ فنِ جہاں رانی   دُنیا ہے کہ سوتی ہے جادو ہے کہ چلتا ہے

ان کا بحیثیت ایک فنکار آزادی کے بعد کی نسلوں پر یہ احسان ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ اس ماحول میں جب کہ فرقہ پرست قوتوں کے علاوہ خود اشتراکی کرم فرماؤں نے اسلامی تہذیب و تاریخ کو رُسوا کرنے اور اسکی صورت مسخ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ نشورؔ نے حیاتِ تازہ کی کرن سے افسردگی و مایوسی کی تاریکیوں کو شکست دینے کی کوشش کی۔ انکی یہ غزلیں اس کی غمّاز ہیں ؎

"ایک سجدہ بھی غلامی میں گراں رکھتا ہوں"

" احترامِ رسن و دار کیا ہے میں نے "

اور ان کے یہ اشعار ہماری رگوں میں لہو کی گردش تیز کر دیتے ہیں ؎

زندگی عشق کی اے دوست جوانی مانگے | دھڑکنیں دل کی گنے خوں میں روانی مانگے
عشق ہر عاشقِ صادق سے نشانی مانگے | پیش کر داغ اگر دل پہ کوئی کھایا ہے

طوفاں کے سہارے جینا ہے ساحل کی تمنا کون کرے | موجوں کے ستم سے گھبرا کر کشتی کا تقاضا کون کرے

دماغوں پر ہمیں چھائے ہوئے ہیں | نشورؔ اک دور ہے منکر تو کیا غم

نشورؔ اپنی قوم کی بے حسی و کم کوشی، کوتاہ دستی و پست ہمتی پر کبھی کبھی جھنجھلا اُٹھتے ہیں۔ اس کیفیت میں ان کے تغزل میں طنز کا نشتر بھی شامل ہو جاتا ہے ؎

کہاں تک ساتھ چل سکتا ہے فن کی آزمائش ہے | یہ انسانوں کے بے جان قافلے یہ دوری منزل

ہیں فقط مُردہ چراغوں کا دھواں رکھتا ہوں | غیر کے ہاتھ میں آزادی روشن کا چراغ

بُتوں نے پھر تری دُنیا سنبھالی | بِنا کعبہ کی بُت خانہ نے ڈالی
مُبارک مجھ کو دورِ پائمالی | چمن کا سبزہ خوابیدہ ہوں میں
بہ اندازِ ہجومِ خستہ حالی | مرے سینے میں ہے جوشِ عزائم
زوال آگہ ہے میری لازوالی | یہ بازو انقلابات آزما ہیں

ساتھ ہی ساتھ نشورؔ اس دور کی بیمار تہذیب اور بدحال انسان پر بھی اظہارِ ملال کرتے ہیں ؎

ہم آدمی ہیں یہ دراصل آدمی بھی نہیں | ہر ایک فرد ہے حیوان خوش لباس نشورؔ
نظر نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کیلئے | ہزار شمع فروزاں ہے روشنی کیلئے

کچھ پسِ پردہ نہیں پردۂ در باقی ہے　　بے مئے و رنگ ہے کاشانۂ تہذیبِ جدید

محبت ہے مگر جانے کہاں ہے　　ہر اک چہرے سے بے ربطی عیاں ہے

یہ دُنیا پھر انھیں کانٹوں سے کیوں دامن بچاتی ہے　　مسلسل گلشنِ ہستی میں کانٹے اس نے بوئے ہیں

لیکن ان حالات سے شکستہ خاطر نہیں ہوتے۔ انکی فطری رجائیت اور آرزومندی انھیں ایک روشن مستقبل کا نقیب بنا دیتی ہے۔ وہ مسلسل سفر اور جد وجہد کو تقاضائے حیات سمجھتے ہیں اور ہر حال میں خوش رہنے کا مشورہ دیتے ہیں ؎

ایک سفر ختم ہوا ایک سفر باقی ہے　　کوچ ہی کوچ ہے ہر رنگ میں دنیا کی حیات

اک چراغ تہِ داماں تو جلا رکھا ہے　　عشق نے کچھ نہ کیا تیرہ شبی میں لیکن

کچھ گرد بھی اٹھتی ہے جب قافلہ چلتا ہے　　عنوانِ ترقی ہے یہ تیرہ فضائی بھی

برگِ گُل کو کبھی تلوار کیا ہے ہم نے　　تیز تر لہجۂ گفتار کیا ہے ہم نے

وہ شاعری کیلئے نئے ولولے کو ضروری قرار دیتے ہیں ؎

شاعری چاہتی ہے نئے وَلولے

ان کے نزدیک نکمّی قوموں کو دُنیا میں زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ؎

قدرت بھی نکمّی قوموں کو دُنیا سے فنا کر دیتی ہے

وہ جھوٹے سہاروں پر زندہ رہنا موجبِ ہلاکت تصوّر کرتے ہیں ؎

یہ بادل اُڑ کے آتے ہیں مگر سایہ نہیں کرتے　　کبھی جھوٹے سہارے غم میں راس آیا نہیں کرتے

حضرت نشوؔر نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اُردو شاعری میں رومان و شباب کی دُھند چھائی ہوئی تھی۔ اقبال کے انقلاب آفریں و فکر انگیز نغموں کے شانہ بہ شانہ فنکاروں کی ایک

بڑی تعداد شعر و افسانہ کی دنیا میں جوانی و حسن اور شراب و ساغر کی داستان میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نشتور نے بھی اسی مذاقِ سخن کے ساتھ آغازِ شعر گوئی کیا چنانچہ اس عہد کے کلام کو سامنے رکھ کر آل احمد سرور نے ان کو شاعرِ شبابیات قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "صہبائے ہند" میں جو ۱۹۳۹ء میں منظرِ عام پر آئی اس طرح کے اشعار کی کمی نہیں جو عمر خیام اور حافظ شیرازی کے پہلو بہ پہلو ان کو لا کھڑا کرتے ہیں۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں ؎

"نشتور جرعۂ صہبا بھی زندگانی ہے"
"مدت کے بعد پی تو نشہ تیز ہو گیا"

شراب لاؤ کہ عالم تمام فانی ہے | میں شاد ہوں تو زمانہ میں شادمانی ہے
یہ وہ مئے ہے جو فرطِ کیف سے چھائی نہیں جاتی | جوانی کو گنا ہوں سے الگ کرنا نہیں ممکن

اس عہد میں ان کے تغزل کا بانکپن اپنے شباب پر ہے، پیکر تراشی میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے اور پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں ایک البیلے غزل گو کی حیثیت سے منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ان کی رس بھری غزلوں میں مٹھاس، لوچ، نرمی اور خوش آہنگی ہمارا دل جیت لیتی ہے کبھی کبھی داغ دہلوی کے ہم پلہ اور کبھی اردو کے کلاسیکی شعراء کے ہم رتبہ نظر آتے ہیں ؎

نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بت خانہ | یہاں سجدہ وہاں سجدہ معاذ اللہ دیوانہ
یہی عمر جاگنے کی یہی نیند کا زمانہ | کوئی آج تک نہ سمجھا کہ شباب ہے تو کیا ہے
نہ کہیں ترا ٹھکانہ نہ کہیں مرا ٹھکانہ | شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا

اردو شاعری میں حسن کے ادا شناس بہت کم اس رتبہ کے شاعر ملیں گے۔ وہ اس

کائنات میں بکھرے حسن و جمال کو بہر رنگ و بہر ادا دیکھتے ہیں ۔ دو سو سال قبل ولی دکنی، حسنِ ماورا اور حسنِ مجرد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے ؎

جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہونگا　　چہرے کو ترے مصحفِ قرآں سے کہونگا
(ولی دکنی)

یہی سلسلہ حضرت نشور تک محسوس ہوتا ہے کہ بہ تمام و کمال چلا آیا ہے ۔ بیسویں صدی کے تعقل پسندی اور حقیقت نوازی اور منطقیت کے عہد میں نشور بھی میر کے ہم خیال نظر آتے ہیں :؎　　ساری کتابیں میں نے رکھیں گھر کے طاق میں
(میر)

اور نغمہ سرا ہوتے ہیں ؎

انکے خرامِ ناز کے آگے رک سی گئی ہر گردشِ عالم　　زلفِ حسیں نے نورِ جبیں نے شام و سحر کو روک لیا ہے

زلف کا اشارہ عجب انوکھے انداز میں بار بار انکی غزلوں میں لہراتا ہے ؎

گیسوئے سیاہ کی یہ حسیں درازیاں　　رات کیوں کہوں انہیں رات کی دعا کہوں

پھر وہ مجاز سے حقیقت تک کا سفر زینہ بہ زینہ طے کرتے ہیں ۔ انکے اندر فکر و نظر کی گہرائی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے ۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتے اور کائنات کے بسیط حقائق سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

بادۂ سوز و ساز بھی جرعہ بہ جرعہ چاہیئے
ایسی بھی بیخودی نہ ہو دامنِ یار چھوٹ جائے
اِک کشمکشِ غم ہے اور شوق کی منزل ہے
دامن بھی بچانا ہے شعلہ بھی مقابل ہے

وہ اس کائنات کے ہر گوشے میں حسنِ مطلق کی جھلک دیکھتے ہیں اور تخلیقِ کائنات کے عظیم مقاصد

کا احساس تازہ ہوتا ہے ؎

پتّے پتّے کا نہیں گلشنِ عالم میں جواب   ذرّہ ذرّہ میں دھڑکتا ہے دلِ یکتائی

وہ ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے ہمارے آفاق گیر حقائق کا عرفان لے کر جلوہ گر ہوتے ہیں ؎

حُسن یہاں نظر فریب دَرد یہاں جگر گداز   ہائے کہ مِٹ گیا نشور جلوۂ بے ثبات پر

تغیّرات کے عالم میں زندگانی ہے   شباب فانی نظر فانی حُسن فانی ہے

فکرِ تعمیر دو جہاں بے سُود   اک جہانِ خراب باقی ہیچ

مجھ میں بھی اک کشش ہے انھیں کے جمال کی   انکی تجلّیوں سے نکھرتا ہوں میں کبھی

ہاتھ سے دنیا نکلتی جائیگی   اور دنیا ہاتھ ملتی جائیگی

سب بھول گئے پیچ و خمِ ہوش میں رستہ   اس راہ میں کچھ عشق کے مارے نکل آئے

ترجمانِ راز ہوں یہ بھی کام ہے مرا   اس لبِ خموش نے مجھ سے جو کہا کہوں

غیر میرا حالِ غم پوچھتے رہے مگر   دوستوں کی بات ہے دشمنوں سے کیا کہوں

نشور کے تخلیقی سفر کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایک بیدار مغز فنکار سے روشناس ہونے کا موقعہ ملتا ہے جو درجہ بہ درجہ اور زینہ بہ زینہ اپنے گرد و پیش کے احوال کے مشاہدے فکری پختگی و جامعیت کے مراحل طے کرتا نظر آتا ہے۔ ان کی اس ارتقاء پذیری کو فراق ان کو ایک ترقی پسند شاعر قرار دیتے ہیں حالانکہ ان کو مارکس کے جدلیاتی فلسفے سے اور کائنات کی محض مادی تعبیر سے کوئی نسبت نہیں۔ سرور کے الفاظ میں وہ نہ قدامت کے اسیر ہیں اور نہ جدت سے بیزار۔ ان کا عصری شعور انھیں ایسی آفاقیت عطا کرتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور وہ ایسے اشعار کہنے لگتے ہیں جو ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھ

جاتے ہیں اور لوگوں کی دلوں کی دھڑکن بن جاتے ہیں ؎

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے　　چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

جسے چاہے مالکِ رنگ و بو اسی پے رہی ہیں نوازشیں　　میں اِدھر تھا منتظرِ کرم کہ نگاہِ ناز اُدھر پڑی

جلوہ تیرا اور نظارہ پرستوں کا ہجوم!　　اے تماشہ گر تجھے کس نے تماشہ کر دیا

جیا لیکن مرا جینا کسی کے بھی نہ کام آیا　　میں مرتا ہوں کہ شاید زندگی پیغام ہو جائے

اور وہ شاعر جس نے صہبا و پیمانہ سے اپنا سفر شروع کیا تھا اور جو شباب کی جولانیوں سے زیادہ سرمستیوں کا شیدائی تھا اور جو حسن و رعنائی پر اس قدر فریفتہ تھا کہ اس کے اشعار یک برقی لہر کی طرح کوند جاتے تھے ؎

تابانیاں میں عرض کروں کیا شباب کی　　سانچے میں ڈھل گئی ہے کرن آفتاب کی

یا ـــــ　آنکھوں میں موج کھیل رہی ہے شراب کی

وہ اپنی ملت کے زوال پر اس طرح نالہ سرا ہوتا ہے ؎

جاں بازوں کے لب پر بھی اب عیش کا نام آیا　　جس ہاتھ میں تیشہ تھا اس ہاتھ میں جام آیا

ابھی ہندوستاں میں انقلاب آیا ہے ایسا ہی　　کوئی بہرِ دعا جیسے سرِ لوح مزار آئے

ور یہ تقاضا کرتے ہیں ؎

پیش کر داغ اگر دل پہ کوئی کھایا ہے
عشق ہر عاشقِ صادق سے نشانی مانگے

غرض کشور نے اس عہد میں نہ صرف اُردو شاعری کی آبرو باقی رکھی بلکہ مشرق کی درخشاں تمدنی روایات و اقدار کی اعلیٰ درجہ کی فنکارانہ چابکدستی سے تائید کی۔

انھیں اس عہد یعنی بیسویں صدی کے اُردو غزل کے صفِ اوّل کے فنکاروں میں بغیر کسی تأمّل کے اس عہد کا ادبی مورّخ و نقاد جگہ دے گا اور آنے والی نسلیں ان کے کلام کے ذریعے اپنے تہذیبی سرمایہ سے بحسن و خوبی روشناس ہوتی رہیں گی۔

ڈاکٹر سید عبد الباری

نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ
ڈاکٹر امبیڈکر نگر۔ یوپی

جلوۂ نشور

آفاق کا ہر جلوہ نشور اس میں عیاں ہے
مل جل کے وہ آئینۂ فن ہم نے بنایا

حضرت نشور کو کان پور کے نوجوانوں نے دریافت کیا تھا، ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ حلقۂ درس و تدریس سے باہر نہ آتے ۔ سنہ ۱۹۴۰ء سے کچھ پہلے، ان کے ترنم نے نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ نشور صاحب کو الہ آباد سے آئے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا۔ درس نظامی اور علوم مشرقیہ کا یہ عالم اس لئے پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ پردے کے پیچھے اپنی جلوہ سامانیوں کو سمیٹے بیٹھا رہتا۔ مستانہ روی، ان کے قدموں کو درون و بیرون میخانہ اُکساتی رہی۔ سنہ ۱۹۳۸ء سے باقاعدہ مشاعروں میں شرکت شروع کر دی۔ کلام کی فطری غنائیت الگ، ترنم کی پری اُنہیں سحر البیان کے بے نظیر کی طرح لے اُڑی، پھر وہ ایسے عالم میں پہنچ گئے جہاں یہاں کے سے درو دیوار نہیں تھے۔ اسے استعاراتی تمثیل جانئے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نشور صاحب نے غزل کا شاعر ہوتے ہوئے روایت کی ٹکی بندھی پاسداری نہیں کی، انھوں نے پوری طرح تو اس ملنگے ہوئے جہان کو نہیں پھونکا ہاں زلزلہ سا ضرور پیدا کر دیا اور چند بے ساختہ رنگوں سے روایت کی ازسرِ نو حنا بندی شروع کر دی، اس حنا بندی سے جو روش قائم ہوئی، وہ بڑھتے بڑھتے شاہراہِ نشور بن گئی۔

نشور صاحب کے کلام پر کسی باقاعدہ نقاد نے قلم نہیں اٹھایا اس کی بڑی وجہ خود نشور صاحب کی بے نیازی، قناعت پسندی، گوشہ نشینی اور مزاج خانقاہی تھا۔ وجوہ میں میں نے گوشہ نشینی کا بھی ذکر کیا ہے، آپ کہیں گے مشاعروں، ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ سے جڑا ہوا فن کار گوشہ نشین کیسے ہو سکتا ہے تو میری وضاحت یہ ہے کہ گوشہ نشینی مزاج کی کیفیت کا نام ہے، عین محفل میں بھی آدمی تنہا رہ جاتا ہے اور تنہائی کو بھی محفل اور قہقہہ زار بنا لیتا ہے۔

اس کی اور دنیا ہے میرا اور عالم ہے
گفتگو میں ہے مصروف میرا ہم سخن تنہا

غزل کا شاعر منصوبہ بندی سے عاری ہوتا ہے اور نظم کا شاعر منصوبہ بندی کے بغیر نوالہ بھی نہیں توڑتا۔ دونوں باتیں نہ تو عیب ہیں نہ ہنر صرف نظم اور غزل کے فن کار کی شناخت ہیں جوش صاحب فیض صاحب، چکبست، ساحر، مخدوم یہاں تک کہ ہمارے میاں نظیر بھی منصوبہ بند تھے۔ نظم ترتیب اور منصوبہ بندی کو نئے نئے سانچوں میں متشکل کرتی ہے اور غزل خاکستر پر رقص جنوں کی ہم عناں ہوتی ہے، ایک جگہ فکر کا سلیقہ نظر آتا ہے تو دوسری جگہ جذبہ سلیقے میں ڈھلتا ہے۔ فکر و جذبہ کے فرق کے ساتھ آپ نظم و غزل کے باہمی فرق کو سمجھ سکتے ہیں۔ نشور صاحب نے کثرت سے نظمیں کہی ہیں اس کثرت سے کہ آپ انہیں سودا کی طرح غزل اور نظم کا کامل شاعر کہہ سکتے ہیں جب کہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہے۔

نشور بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے جس طرح غالب اور فیض بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے غالب، فیض اور نشور کی نظموں میں جو حسن اور بے پناہی آئی ہے وہ سب غزل کی بے محابائی، دارائی کے طفیل ہے۔ غزل اپنے لمس سے اردو شاعری کے تمام اصناف کو طاق پر سجانے کے لائق بناتی

رہی ہے۔ میرا یہ بیان صرف اُردو شاعری کے تعلق سے ہے۔ اسے آپ دُوسری زبانوں کے باطنی حسُن سے لڑا اور ٹکرا نہیں سکتے۔ غزل بھی اپنے باطنی حسُن کے سبب لفظوں کی ترتیب کی بنا پر غزل بنتی ہے اور مختلف شاعروں کے یہاں لفظوں کی یہی مخصوص ترتیب مختلف لہجوں یا اسالیب کو جنم دیتی ہے۔ میر صاحب کے یہاں لفظ ہیجان کی سطح پر ترتیب پاتے ہیں اور یہ ہیجانی ترتیب انھیں بلند آہنگ کر دیتی ہے، میر صاحب کے یہاں لفظوں کی یہ ترتیب سرورِ کم خوابی یا بے خوابی کی سطح پر ترتیب پاتی ہے، اس لئے ان کا لہجہ فقر و غنا کی اور سرشاری کی تحویل میں چلا جاتا ہے، میں شاعر ہوں اس لئے میں جس انداز میں شعر کی تخلیق اور شاعر کے باطن میں جھانکتا ہوں، اُسی طرح اپنی بات کہنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں اگر آپ نشور کی شاعری خصوصاً نشور کی غزل کا مطالعہ کریں، تو میری طرح شاید آپ بھی محسوس کریں گے کہ نشور کا لہجہ، اپنے عہد کا منفرد لہجہ تھا، انفرادیت کا حسُن ہمیشہ شاعر کے باطن سے نمود کرتا ہے۔ لہجے کی یہ انفرادیت نشور کے ترنم کے سیاق سباق میں خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ نشور صاحب کے ترنم سے جو لوگ محظوظ ہوئے ہیں، یا جن لوگوں نے انہیں غزل سرائی کرتے سنا ہے، وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ نشور کی غزل، ان کے ترنم کی پروردہ تھی اور ان کا ترنم ان کی غزل کا زائیدہ۔ ہم لوگوں نے نہ غالب کو پڑھتے دیکھا ہے، نہ میر و سودا کو، مگر یقین کیجئے کہ اگر سائنس کا کوئی عجوبہ ان کی آوازوں کو ہمارے لئے محفوظ اور منتشکل کر سکے تو ہم دیکھیں گے کہ لہجہ، فکر سب ایک دُوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہوں گے، یہاں ترنم اور تحت کی کوئی قید نہیں۔

نشور صاحب کو میں نے اپنے بچپن میں سُنا تھا، جگر صاحب، مجروح اور خمار صاحب کو بھی۔ ان سب کے عہدِ شباب ہی میں سُنا تھا اور آج محسوس کرتا ہوں تو اپنی اس بات میں یا عقیدے میں بڑی پختگی پاتا ہوں

کہ آواز اور شعر کی ادائیگی ہی شاعر کے بارے میں سب کچھ بتا دیتی ہے اور اس کے درجے کا تعین بھی اسی اُتار چڑھاؤ میں ہو جاتا ہے۔ میر صاحب نے شاید اسی بات کی تصدیق اس شعر میں کی ہے ؎

میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز ٭ اسی خانہ خراب کی سی ہے

اس شعر کو پڑھتا رہا ہوں اور پڑھاتا بھی رہا ہوں لیکن اس وقت صرف اس تحریر کے ضمن میں اس شعر نے از سرِ نو مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے، گویا یہ شعر مجھ پر پہلی بار منکشف ہوا ہے، آپ اس کی تشریح کسی بھی سیاق و سباق میں کریں، میں آپ سے لڑائی جھگڑا نہیں کروں گا۔ میں آزادیٔ رائے یا محسوسات کی آزادی پر قدغن لگانے کا قائل نہیں، چاہے وہ میرے لئے ہو یا کسی دوسرے کیلئے۔ نشور صاحب اپنے لہجے کے منفرد شاعر تھے اور زمانہ یہ وہ تھا کہ جگر کی غزل اور آواز نے آزادی سے جینے، سوچنے اور اپنی راہ کو متعین کرنے کی راہیں مسدود کر دی تھیں۔ جگر کا ترنم، ان کی غزل کا آہنگ، ان کی غزل کی ساری منشورِ وقت بن گئے تھے۔ صورتِ حال بالکل یہی تھی جو میں بیان کر رہا ہوں، میرے ہم عمر سخن شناس میری تائید کریں گے۔ اس حال میں اگر کوئی اپنی راہ نکال لیتا ہے، اپنی شناخت بنا لیتا ہے تو اُسے واقعی جینے کا حق ہے (شعر و ادب میں)۔ میں پھر ماضی کے جھروکوں سے گذر رہا ہوں اور ایک تربیت یافتہ بچّے کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں اور کانوں سے سُن رہا ہوں مشاعرے اس عہد کی شاعری اور شاعری کے معیار کا بڑا معتبر حوالہ تھے۔ مجھے نشور صاحب کے ساتھ ساتھ ایک آواز اور بھی بہت چونکا دینے والی لگی تھی، وہ آواز تھی عزیز حامد مدنی کی۔ جن لوگوں نے جگر صاحب کے ہوتے ہوئے اور جگر صاحب کی آنکھوں کے سامنے خود کو منوایا ہے ان میں نشور صاحب اور عزیز حامد مدنی کو بُھلایا نہیں جا سکتا۔

اس مختصر سے مضمون میں شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں، میں صرف ان گوشوں پر دستک

دے رہا ہوں، جو کچھ نہ سہی تو ایک ہیولے کو قاری کے سامنے ترتیب دے سکے۔ نشور کی شاعری طمانیت قلب و نظر کی سیدھی سچی دستاویز ہے۔ دل کی کارفرمائی بہت ہے مگر دل گرفتگی نہیں ہے ایسی محبت بھری اور آسودہ شاعری خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ تشنگی اور سودائے سر کی مضحک تصویروں سے نشور کی شاعری پاک ہے، یہاں تضاد یا قول محال کی کوئی بات نہیں صرف سکون سے محسوس کرنے کی بات ہے، یعنی شاعری میں عشق کی کارفرمائی بھی ہو، آسودگی بھی ہو اور جذبوں میں کسی طرح کی تشنگی نہ ہو، یہ بیان ان کانوں کو گرم کردے گا جو موجودہ تنقیدی رویوں سے ایسا ہم آہنگ ہو چکے ہیں کہ کوئی نیا احساس، فکر کا کوئی اچھوتا پن خوش نہیں آتا اور نتیجتاً جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں عشق کے مظاہر میں گرم سانسیں، آنسو، خراشیں اور نالۂ نیم شب ہی گنے جاتے ہیں۔ عشق باطن کو آسودہ کرسکتا ہے آنکھوں کو ٹھنڈک دے سکتا ہے، جسم کے ساتھ دل کو انبساط آشنا کرسکتا ہے، یہ ہم نے سوچا ہی نہیں اگر اس بات کو ثبوت کے ساتھ پیش کیا جائے تو ہم اسے بغیر کسی دلیل کے مسترد کردیں گے یہی رسمیات کا کٹرپن کہلاتا ہے۔ آئین لوے ڈرنے کی رسم یکساں طور پر مذہب کے ساتھ ساتھ شعر وادب میں بھی جاری و ساری ہے، اسی لئے ہم صرف عشق کی شعلہ فشانیوں کو قبول کرسکتے ہیں اس کی شبنم سامانیوں سے انکاری ہیں۔ میں نشور کی شاعری میں شبنم سامانیوں کو دیکھتا ہوں، دل و نگاہ کے تعلق سے نشور صاحب نے بہت ہی آسودہ زندگی بسر کی تھی، یہ سلسلہ مکتب سے شروع ہوا اور دمِ واپسیں تک جاری رہا، مومنہ واحدی کی رفاقت نے نشور صاحب کو دل کی دنیا سے باہر نکلنے کی مہلت ہی نہ دی، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ سڑک پر چلتے ہوئے بھی نگاہ، دل ہی کی طرف رکھتے تھے، پھر انھوں نے اس آئینہ کو ٹوٹنے بھی نہ دیا، شاید میں یہ سب کچھ گہری واقفیت کی بنا پر لکھ رہا ہوں، مطالعے کی گہرائی اور گیرائی کا شاید جسم مطالبہ بھی یہی ہے کہ ہم جزئیات کو بھی دل پر نقش کرتے رہیں، شعر اور شاعر کو سمجھنے کے لئے یہ کلید ہے، بیساکھی نہیں۔

گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے اور نشور صاحب کی شاعری کی طرف موڑتے ہوئے میں ایک بات عرض کرتا چلوں کہ نشور صاحب، بند آنکھوں سے بھی بیرونِ در دیکھ لیا کرتے تھے، دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو آنکھوں کا کھلنا اور موندنا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے. مشاہدے کی کثرت کوئی چیز نہیں مشاہدے کی ترتیب سل کو دل بناتی ہے. نشور صاحب نے عنفوان شباب میں جو کچھ دیکھ لیا تھا، جو کچھ محسوس کر لیا تھا ساری زندگی اسی کی تہذیب و ترسیل میں بسر کر دی، گویا ساری زندگی ایک ہی کروٹ میں بسر ہو گئی.

نشور صاحب کی شاعری میں مشاہدات کا اتنا تنوع نہیں، جتنا کیفیات میں تنوع ہے، وہ ایک ہی رنگ میں کئی جذبے دیکھ بھی سکتے تھے اور دکھا بھی سکتے تھے. غزل کے فن سے ان کی شاعری خلقی طور پر ہم آہنگ تھی. میں شروع میں شاید یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ ان کی شاعری کی اصل غزل تھی، وہ جوش کی طرح نظم گو نہیں تھے. نظم کا شاعر غزل کی دھنک سے محروم ہی رہتا ہے، اور غزل کا شاعر تمام اصنافِ شعری کی ست رنگیوں کا امین ہوتا ہے. نشور صاحب کی نظموں میں بھی جو حسن اور دلآویزی نظر آتی ہے وہ سب غزل کی چھوٹ کے سبب ہے. نشور کی غزل، غزل کے لغوی معنی سے قریب تر ہے، اُن کی غزل لبِ رخسارِ غزل کا ہالہ بن کر رہی. لب و رخسارِ غزل سے میری مُراد عکس و لمس سے محدود ہے. اس عکس و لمس کو وہ کبھی دو آتشہ بناتے ہیں اور کبھی سہ آتشہ. دو آتشہ اور سہ آتشہ سے آپ تکرارِ لفظی مُراد لیں. ان کی غزل کا خاص وصف یہ ہے کہ پہلے وہ ترکیبیں وضع کرتے ہیں، اور پھر ان کے جوڑے بنا ڈالتے ہیں. مثال کے طور پر ؎

شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا ✿ نہ کہیں ترا ٹھکانہ، نہ کہیں مرا ٹھکانہ

"شبِ غم" کی تکرار اور "ٹھکانے" کی تکرار نے جو لطف پیدا کیا ہے، وہ ایسا ہے کہ ہم اسے دیکھ بھی رہے ہیں اور محسوس بھی کر رہے ہیں. اسی طرح ؎

دے رہا ہوں، جو کچھ نہ سہی تو ایک ہیولے کو قاری کے سامنے ترتیب دے سکے۔ نشور کی شاعری طمانیتِ قلب و نظر کی سیدھی سچی دستاویز ہے۔ دل کی کارفرمائی بہت ہے مگر دل گرفتگی نہیں ہے ایسی محبت بھری اور آسودہ شاعری خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے تشنگی اور سودائے سر کی مضحک تصویروں سے نشور کی شاعری پاک ہے، یہاں تضاد یا قولِ محال کی کوئی بات نہیں صرف سکون سے محسوس کرنے کی بات ہے، یعنی شاعری میں عشق کی کارفرمائی بھی ہو، آسودگی بھی ہو اور جذبوں میں کسی طرح کی تشنگی نہ ہو، یہ بیان ان کانوں کو گرم کر دے گا جو موجودہ تنقیدی رویوں سے ایسا ہم آہنگ ہو چکے ہیں کہ کوئی نیا احساس، فکر کا کوئی اچھوتا پن خوش نہیں آتا اور نتیجتاً جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں عشق کے مظاہر میں گرم سانسیں، آنسو، خراشیں اور نالۂ نیم شب ہی گنے جاتے ہیں۔ عشق باطن کو آسودہ کر سکتا ہے آنکھوں کو ٹھنڈک دے سکتا ہے، جسم کے ساتھ دل کو انبساط آشنا کر سکتا ہے، یہ ہم نے سوچا ہی نہیں اگر اس بات کو ثبوت کے ساتھ پیش کیا جائے تو ہم اسے بغیر کسی دلیل کے مسترد کر دیں گے یہی رسمیات کا کٹر پن کہلاتا ہے۔ آئینِ نو سے ڈرنے کی رسم یکساں طور پر مذہب کے ساتھ ساتھ شعر و ادب میں بھی جاری و ساری ہے، اسی لئے ہم صرف عشق کی شعلہ فشانیوں کو قبول کر سکتے ہیں اس کی شبنم سامانیوں سے انکاری ہیں۔ میں نشور کی شاعری میں شبنم سامانیوں کو دیکھتا ہوں، دل و نگاہ کے تعلق سے نشور صاحب نے بہت ہی آسودہ زندگی بسر کی تھی، یہ سلسلہ مکتب سے شروع ہوا اور دمِ واپسیں تک جاری رہا، مومنہ و احمدی کی رفاقت نے نشور صاحب کو دل کی دنیا سے باہر نکلنے کی مہلت ہی نہ دی، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ سڑک پر چلتے ہوئے بھی نگاہ، دل ہی کی طرف رکھتے تھے، پھر انھوں نے اس آئینہ کو ٹوٹنے بھی نہ دیا، شاید میں یہ سب کچھ گہری واقفیت کی بنا پر لکھ رہا ہوں، مطالعے کی گہرائی اور گیرائی کا شاید ہم سے مطالبہ بھی یہی ہے کہ ہم جزئیات کو بھی دل پر نقش کرتے رہیں، شعر اور شاعر کو سمجھنے کے لئے یہ کلید ہے، بیساکھی نہیں۔

گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے اور نشورؔ صاحب کی شاعری کی طرف موڑتے ہوئے میں ایک بات عرض کرنا چاہوں کہ نشورؔ صاحب، بند آنکھوں سے بھی بیرونِ در دیکھ لیا کرتے تھے، دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو آنکھوں کا کھلنا اور موندنا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے. مشاہدے کی کثرت کوئی چیز نہیں، مشاہدے کی ترتیب سل کو دل بناتی ہے. نشورؔ صاحب نے عنفوانِ شباب میں جو کچھ دیکھ لیا تھا، جو کچھ محسوس کر لیا تھا ساری زندگی اسی کی تہذیب و ترسیل میں بسر کر دی، گویا ساری زندگی ایک ہی کروٹ میں بسر ہو گئی.

نشورؔ صاحب کی شاعری میں مشاہدات کا اتنا تنوّع نہیں جتنا کیفیات میں تنوّع ہے، وہ ایک ہی رنگ میں کئی جذبے دیکھ بھی سکتے تھے اور دکھا بھی سکتے تھے. غزل کے فن سے ان کی شاعری خلقی طور پر ہم آہنگ تھی. میں شروع میں شاید یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ ان کی شاعری کی اصل غزل تھی، وہ جوشؔ کی طرح نظم گو نہیں تھے. نظم کا شاعر غزل کی دھنک سے محروم ہی رہتا ہے، اور غزل کا شاعر تمام اصنافِ شعری کی ست رنگیوں کا امین ہوتا ہے. نشورؔ صاحب کی نظموں میں ہمیں جو حسن اور دلآویزی نظر آتی ہے وہ سب غزل کی چھوٹ کے سبب ہے. نشورؔ کی غزل، غزل کے لغوی معنی سے قریب تر ہے، اُن کی غزل لب و رخسارِ غزل کا ہالہ بن کر رہی. لب و رخسارِ غزل سے میری مُراد عکس و لمس سے محدود ہے، اس عکس و لمس کو وہ کبھی دو آتشہ بناتے ہیں اور کبھی سہ آتشہ. دو آتشہ اور سہ آتشہ سے آپ تکرارِ لفظی مُراد لیں. ان کی غزل کا خاص وصف یہ ہے کہ پہلے وہ ترکیبیں وضع کرتے ہیں، اور پھر ان کے جوڑے بنا ڈالتے ہیں. مثال کے طور پر ہ

شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا ؛ نہ کہیں ترا ٹھکانہ، نہ کہیں مرا ٹھکانہ

"شبِ غم" کی تکرار اور "ٹھکانے" کی تکرار نے جو لطف پیدا کیا ہے، وہ ایسا ہے کہ ہم اسے دیکھ بھی رہے ہیں اور محسوس بھی کر رہے ہیں. اسی طرح ہ

کوئی کہتا ہے مسجد ہے کوئی کہتا ہے بارِ حبا
الٰہی! کیا میں بھولا ہوں رہِ میخانہ مستی میں

"کوئی کہتا" کی تکرار نے صرف غنائیت ہی نہیں پیدا کی ہے بلکہ مزاج کی اس مستی کا بھی حوالہ بن گئی ہے جو خود لذتی کا اشاریہ یا ثبوت ہے۔ اس تکرار کے کچھ نمونے اور دیکھئے ؎

چمن چمن ہے محبت، جہاں جہاں ہے جمال
یہ اہتمام ہے اِک دل کی زندگی کے لئے

نظر نظر کو ساقیٔ حیات کہتے آئے ہیں
ان انکھڑیوں کو میکدے کی رات کہتے آئے ہیں

اس کے علاوہ انھوں نے ہم وزن ٹکڑوں کو بھی اپنی شاعری کا ہنر بنایا ہے، جیسے ؎

آغازِ محبت ہے اور دل یوں ہاتھ سے نکلا جاتا ہے
جیسے کسی الھڑ کا آنچل سر کا جائے ڈھلکا جائے

"سر کا جائے" اور "ڈھلکا جائے" محلِ نظر ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں ؎

کنگھے سے گھنیری زلفوں میں یوں لہریں اٹھتی جاتی ہیں
جیسے کہ دھندلکا ساون کا بڑھتا جائے بڑھتا جائے

گویا لفظوں کی تکرار سے وہ صوتی ہم آہنگی کا سراغ پاتے رہتے ہیں۔ ترنم اور شاعری کو میں مترادفات میں سے سمجھتا ہوں۔ میرا یہ مضمون نشور صاحب کے مخصوص شعری رویے پر ہے۔ یہاں کوئی بحث چھوٹی شاعری اور بڑی شاعری کے تعلق سے نہیں ہو رہی ہے، مقصد یہ ہے کہ فن کا عہد ساز خود اپنے میں ایک ہنر ہے۔ عہد ساز سے میری مراد یہ ہے کہ جس کی نقل

کی جائے اور بطور فصیل جس کا تتبع کیا جائے۔ نشور صاحب کے ترنم اور شاعری دونوں کی نقل کی گئی ہے دلی والے اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ زمانہ طالب علمی میں جب میں نے پہلی بار دہلی یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرے میں شمیم کرہانی کو غزل سرائی کرتے ہوئے دیکھا تو معاً مجھے نشور صاحب یاد آئے میں نے اپنے ساتھیوں جبار اور نورجہاں ثروت سے جب یہ بات کہی تو ان لوگوں نے ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ ہاں ہاں ہم لوگوں نے بھی سنا ہے کہ نشور صاحب شمیم صاحب کی نقل کرتے ہیں۔ مجھے اس بات پر ہنسی آئی اور میں نے کہا کہ شمیم صاحب اور نشور صاحب کی شاعری کی عمر میں تقریباً بیس سال کا فرق ہے۔ میں ان لوگوں سے کیا الجھتا کہ میں ان کے مقابلے میں پہلے ہی سے فارغ التحصیل تھا۔ یہ واقعہ جملۂ معترضہ کی طرح بیچ میں ٹپک پڑا۔ صرف کہنا یہ چاہتا تھا کہ اپنے ترنم میں اور اپنے شعری رویے میں نشور صاحب واقعی الگ تھے اور ان کی یہ انفرادیت وہی تھی۔ جگر، فانی، اصغر یہاں تک کہ حسرت بھی لفظیات کے ردّ و انتخاب میں بڑی مماثلتیں رکھتے ہیں۔ شاعری کے سانچے یا پیٹرن (PATERN) میں سب گذشتگان کے نقوشِ قدم پر گامزن تھے۔ مگر نشور کا ترنم اور پیٹرن کچھ الگ ہی تھے' یہ بات بار بار کہنے کی ہے، کہ میں نشور کی شاعری کا کسی سے موازنہ یا مقابلہ نہیں کر رہا، نہ چھوٹی بڑی شاعری کی بات کر رہا ہوں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ نشور صاحب نے اپنی شاعری کی پہچان بنائی اور اپنے ترنم سے بھی ہمیں چونکایا ہے۔

اس مضمون کو آپ نشور کی شناخت یا پہچان کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔ ایک پہچان کا ذکر تو میں سطور بالا میں کر آیا ہوں دوسری شناخت یہ ہے کہ وہ غزل کو اس کے لغوی معنی سے ہمیشہ قریب رکھنے کی جبلت بھی رکھتے ہیں کہیں کہیں اور کبھی کبھی مسائل عصر سے بھی گزر لیتے ہیں جسے آپ برائے شعر گفتن بھی کہہ سکتے ہیں' وہ احساسِ حسن کے شاعر ہیں' یہ اُن کی دوسری شناخت ہے یا پہلی شناخت کا تتمہ ہے' کیونکہ تکرار لفظی' صوتی ہم آہنگی کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے اور صوتی ہم آہنگی سے اظہارِ حسن کا کام لیا گیا ہے۔ آسودگی بڑی شاعری کے لئے سمِ قاتل ہے مگر کیا کیا جائے کہ یہ آسودگی انہیں بہرحال

حاصل تھی، وہ ساری زندگی خوابوں میں رہے۔ سفر ہو یا حضر سب اُن کے خواب تھے۔

نشورؔ صاحب کی غلافی آنکھیں' ان کی شاعری پر مہر توثیق ثبت کرتی تھیں، اُن کی آنکھیں یہ یقین دلانے میں کامیاب رہتی تھیں کہ جاگتی آنکھوں سے بھی خواب دیکھے جاسکتے ہیں' ان کے چلنے میں ہمیشہ بہل قدمی کا انداز غالب رہتا تھا۔ بڑے آدمی کی (میری مُراد بڑے فن کار سے ہے) پہچان یہ ہے کہ وہ اطوار و عادات میں بھی خفیف الحرکاتی کا مرتکب ہوتا ہوا نظر نہ آئے۔ وہ کبھی عجلت میں نظر ہی نہ آئے' زندگی کو اس طور اپنا پابند بنا لینا یقیناً اہم بات ہے' انھوں نے ساری زندگی صرف فکر کی مستی میں نہیں گزاری بلکہ حقائق کی تلخیوں کو بھی اپنی گرفت میں رکھ کر' اپنے ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے اک تواتر کے ساتھ خواب اور حقیقتیں' ان کے دامن میں پلتے رہے' کہتے ہیں ؎

میری دیوانگی میری فرزانگی

انقلاب و عزائم میں پلتی رہی

کتنی بے درد تھی محفل رنگ و بو

غم برستا رہا مئے اُبلتی رہی

شعریت' پوری نزاکت شاعرانہ کے ساتھ' ان کے یہاں یوں نظر آتی ہے۔ ؎

میں چپ رہا تو وہ بھی تکلف سے چپ رہے

میں نے جو بات کی تو تغافل نے بات کی

ارتباطِ حیات بھی دیکھا ایک محفل ہزار تنہائی

اے گردِ رہِ دانش تو تیز قدم ہو جا میں نکہتِ گلشن ہوں میرا سفر آساں ہے!

بہاریں ہیں جب گوشہ گیر بیاباں صبا سے بھی کہدو کہیں خاک اُڑائے

نشورؔ کے یہاں اپنے علم، ادراک اور نسبتِ خاندانی کے سبب تصوّف کی مشعلیں بھی فروزاں ہیں جس طرح داغؔ کے یہاں تصوّف، زبان کی چاشنی اور ان کے تغزل کی عام شہوت رانی میں دب کر اُبھرتا ہے۔ اسی طرح نشورؔ کے یہاں بھی غزل کے فطری حسن میں تصوّف کا سراغ پانا آسان نہیں۔ یادش بخیر۔ برادرِ محترم ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب نے ایک دن کہا کہ ماشاء اللہ تم ایم اے میں اُردو پڑھاتے ہو۔ داغؔ کے اس شعر کا مطلب بتاؤ، ؎

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں	صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!

میں نے حسبِ روایت کم، داغؔ کی شاعرانہ شخصیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے شعر کے وہی مجازی معنی بتا دیئے جو اس وقت تک میری دانست میں خود شعر چیخ چیخ کر بتا رہا تھا۔

بھائی جان نے کہا— چلئے بس۔ درس و تدریس ہو چکی۔ اس وقت میں چونکا، پھر انہیں کسی مزید وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہاں شرمندگی کئی دن تک مجھ پر طاری رہی۔

اب نشورؔ صاحب کو دیکھئے ؎ :

مٹی سے کرن تک ہے اک عشق کی تابانی	:	کس حسن کا جادو ہے شبنم سے شبستاں تک

ہے امانتِ تجلّی یہ ہجومِ ماہ و انجم	:	کہ سحر نے نور اپنا سرِ شام دے دیا ہے

وہ دیکھتے ہیں کس کس ادا سے	:	آئینہ رکھ کر اپنا ہی عالم

اس شعر کو معرفت کے رنگ میں ڈبونے پر مائل ہوتا اگر فوراً بعد یہ شعر نہ ہوتا ؎

رحمت سے اس کی نزدیک ہو جا	:	دامن بھگو لے اے چشمِ پُرنم

نشورؔ صاحب پر اس سے زیادہ جامع اور تفصیلی مضمون کی ضرورت ہے مگر برادرم نیاز واحدی ہر وقت عجلت میں رہتے ہیں اور اپنے شکار کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیتے۔ میں شکر گذار ہوں جناب

شمیم عثمانی کا، کہ انھوں نے ان سطور کو مجھ سے لکھوانے میں بڑی جاں فشانی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ کا کرم ہے کہ شمیم صاحب کی تنک مزاجی مجھے دیکھ کر مسکراہٹوں میں بدل جاتی ہے، تعلق خاطر شاید اسی کو کہتے ہیں۔ ▲▲

حرفِ آخر: ۲۳ ، اپریل ۱۹۹۹ء

سید ابوالحسنات حقی

خانقاہ دادا میاں

بیکن گنج، کان پور

شعرِ نشور
آفاقیت سے ماورائیت تک

نشور واحدی مرحوم اپنے فن و شخصیت کے لحاظ سے جگر مرحوم کا بدل سمجھے جاتے رہے، جگر ہی کی طرح ان کا بنیادی فن تغزل تھا جس کی اولین خصوصیات دل گدازی اور دلنوازی نغمگی اور شیرینی، برجستگی و بے ساختگی، وارداتِ قلبی اور محسوساتِ وجدانی ہیں اور جس میں شاعر کا محور دل گداختہ ہوتا ہے اور وہ حالات و حوادث کے ہر سانحہ اور ہر واقعہ کو دل کے آئینے میں دیکھتا، اسے محسوس کرتا اور اسے اپنے وجدان و وجود کا حصّہ بنالیتا ہے:

در دلِ ما غمِ دُنیا، غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بُود پختہ کند شیشۂ ما (عُرفی)

نشور بھی جگر و صغر اور حسرت کی طرح تصوّف کا علمی و عملی ذوق رکھتے تھے اور اس مسلک و مشرب کی بہت سی خوبیاں اور خصوصیات، ان کے فکر و وجدان کا حصّہ بن چکی تھیں، اس ذوقِ لطیف کے سبب دُنیا اور ابنائے زمانہ سے بے نیازی و بے پروائی، حالات و واقعات اور ماحول سے ایک طرح کی بے گانگی اور انہیں ایک وسیع، ہمہ گیر اور کائناتی پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش رجائی اور اُمید پرستانہ ذہنیت، ماورائی اور روحانی نقطۂ نظر، انسان دوستی اور حق پرستی، عاشقی اور حسن طلبی، محویت و فنائیت، مستی اور سرشاری جیسی کیفیات و حسّیات، ان کی دلنواز شخصیت اور دلکش کلام میں گھل مل گئی تھیں۔

جگرؔ ہی کی طرح وہ حقیقی شاعر ہونے کے ساتھ اپنے دلکش ترنّم اور پُرسوز لہجہ و آواز کے باعث مشاعروں کے بھی مقبول و کامیاب شاعر تھے، ان سے قریبی تعلق رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ان کا شعری نشوونما، اصغرؔ و جگرؔ، شفیق جون پوری، عارف عباسی، روش صدیقی جیسے شاعروں کے ساتھ ہوا اور ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد اسلامیہ کالج گورکھپور کے ہندوستان گیر مشاعرے میں رکھا گیا ہو جو تھی دہائی کی ابتدا میں منعقد ہوا تھا اور جس میں انھوں نے اپنی متعدد نظمیں اور غزلیں پڑھی تھیں، اس کے بعد کوئی اچھا مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں وہ مدعو نہ کئے جاتے ہوں.

نشورؔ صاحب کی غزل کی اوّلین اور اساسی خصوصیت ان کے لہجے کی انفرادیت اور یکتائی ہے، ہر اچھے شاعر کی طرح ان کی آواز شعری نقار خانے میں، اپنے مخصوص لب و لہجے سے پہچانی جاسکتی ہے، ان کے لہجے میں زور شور کے بجائے نرمی و دلآویزی، دلکشی و دلکشائی، شیرینی و دل نشینی، نغمگی اور ترنّم اور ان کے آہنگ میں درد کی کسک، غم کی کھٹک، اور دل گداختہ و جگر سوختہ کی کھنک اور لپک موجود ہے، ان کے اسلوب میں حرف وصوت یا لفظ و آواز کی نغمگی و شیرینی، خلوصِ دل، صدقِ جذبہ اور شدّتِ احساس کی بیشتر خوبیاں اور رنگینیاں جمع ہوکر نغمے کا اعجاز اور جلترنگ کا انداز پیدا کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے دماغ سے پہلے دِل متاثر ہوتا ہے اور دل سے بھی پہلے سامعہ لطف اندوز ہوتا ہے. غزلِ نشورؔ کی نغمگی و ترنّم ریزی کی بڑی وجہ ان کے اسلوب کی سادگی و بے ساختگی، روانی و جولانی، لفظوں کے انتخاب اور ان کی مناسب و موزوں ترتیب و صفت بندی ہے، وہ ثقیل، بوجھل اور بھاری بھرکم الفاظ سے حتیٰ الامکان اجتناب کرتے ہیں اور عربی فارسی کے اگر نامانوس الفاظ لاتے بھی ہیں تو اس طرح کہ وہ ہمارے ذوق کے لئے اجنبی نہیں رہتے اور سیاق و سباق اور معنی و مفہوم کے تقاضے پر پورے اُترتے ہیں اور غالبؔ وغیرہ بڑے فن کاروں کی طرح ان کے مشکل مستعمل الفاظ بھی انگھڑ ہونے کے

بجائے بگھڑے، بے ڈول کی جگہ سڈول، موزوں اور متناسب اور برمحل معلوم ہونے لگتے ہیں لفظوں کی پہچان، ان کی باریکیوں اور نزاکتوں کی شناخت اور مترادفات و ہم معنی یا ذو معنی الفاظ کے معانی کا باہمی فرق کا عرفان ہی وہ معیار ہے جس سے کسی فن کار کی حیثیت اور عظمت متعین ہوتی ہے۔ نشور صاحب لفظوں اور ترکیبوں کے صحیح، برمحل اور موزوں استعمال کا سلیقہ رکھتے ہیں جس کے سبب ان کے الفاظ جام و مینا کی طرح کھنکتے اور اپنے مفہوم و معنی کے سبب ساغرِ لب ریز کی طرح چھلکتے ہیں۔ بندشِ الفاظ کی خوبی، ترکیبوں کی خوش اسلوبی کے ساتھ ان کے کلام کی نغمگی کی ایک خاص وجہ مترنم اور موسیقی ریز بحروں اور ہیئتوں کا انتخاب بھی ہے۔ ان کی اکثر غزلیں ایسی بحروں میں ہیں جن میں روانی، نغمگی سلاست و حلاوت اور مذاقِ سلیم کے لئے خاص اپیل موجود ہوتی ہے، ان کے الفاظ میں وہ نزاکت و نرمی ہے جس کے بارے میں غالب نے کہا ہے ؎

نزاکت فصلِ گُل میں لب کہ معمارِ چمن
قالبِ گُل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

غزلِ نشور کی دوسری بڑی خصوصیت اس کے مغز و معنی، مطالب و مفہوم اور موضوعات و مضامین کی کثرت و وسعت، تنوع اور رنگا رنگی ہے، ان کے موضوعات مخصوص ہونے کے بجائے زندگی کی مختلف جہتوں اور سمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں، ان میں محنت و سرمایہ کی کشمکش بھی ہے، دین و دنیا کی آویزش بھی ہے، خیر و شر کا تصادم بھی ہے، حسن و عشق کے معاملات بھی ہیں، ارضیت و مجازیت بھی ہے اور رفعت و ماورائیت بھی، روزمرّہ کے مشاہدات بھی ہیں اور انفرادی محسوسات بھی، عوامی مسائل بھی ہیں اور مسائلِ تصوّف بھی، بلند پروازی و نازک خیالی کے ساتھ واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری بھی، ماضی کی روایات کی قدر بھی ہے اور اصلاح و انقلاب کی تمنا بھی۔ غرض ان کے یہاں جدّت و

قدامت، روایت و بغاوت جیسے متضاد عناصر جمع ہیں مگر ایک خوش گوار تناسب اور توازن کے ساتھ جو ان کی فن کاری کے مرہونِ منت ہیں.

اس مقام پر ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ یہاں غالب کی طرح ان کی جدت پسندی تہہ رسی اور دروں بینی اور تازہ کاری کے سبب بسا اوقات ان کے یہاں عجزِ بیان یا اپنی بات پوری طرح نہ سمجھا سکنے کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے جو ہمارے فہم کا قصور بھی ہو سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ فن کار بعض اوقات کسی بالکل نئی کیفیت، وجدانی حالت، یا نامانوس و مخصوص واردات اور عجیب و غریب خیالات کو بھی الفاظ کی گرفت میں لینا چاہتا ہے مگر اسے موزوں الفاظ نہیں مل پاتے یا قامتِ معنی پر الفاظ کا جامہ ہی تنگ ہو جاتا ہے یا تیز رنگوں کی عادی نگاہیں ہلکے رنگوں کے حسن، پیغام اور معنویت کو نہیں دیکھ پاتی ہیں اور فن کار کا دھندلا خاکہ انھیں بے معنی نظر آتا ہے، حالانکہ ایسا کم ہوتا ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے ؛ جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

ان کے کلام کی ایک ممتاز خصوصیت اس کی معنویت، تہہ داری اور ہمہ جہتی و ہمہ گیری بھی ہے، ان کا پیمانۂ سخن کبھی اس طرح چھلکتا اور چھلکتا ہے کہ جس کا رنگ اربابِ صورت کو اور جس کی بو اصحابِ معنی کے مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے اور بسا اوقات یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ ان کی مینائے سخن میں بادۂ عنبی ہے یا شرابِ طہور، اور ان کے فانوسِ خیال میں حقیقت کا نور ہے یا افسانے کا ظہور؟ یہی فنکار آنہ ابہام و الہام، علامت نگاری یا پہلوداری شعریت کی ارتقائی منزل ہے جہاں زندگی جملہ جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور فن، زندگی کا ہم رنگ و ہم آہنگ بن جاتا ہے اور تغزل فلسفہ و تصوف سے بغلگیر ہو جاتا ہے. فارسی میں اس کی بہترین مثال حافظؔ ہیں اور اردو میں مولانا آسیؔ غازیپوری اور اصغرؔ گونڈوی

اور ان کے بعد نشور واحدی۔

نشور واحدی صاحب کے سلسلے میں، ایک خاص بات یہ بھی خیال میں رہے کہ ان کا ذوقِ عمل بہت نکھرا اور ستھرا ہے جس میں لطافت و رعنائی اور رفعت و طہارت کی خاصی کارفرمائی ہے اور ان کے حریمِ جمال و بارگاہِ خیال میں کثافت و آلودگی کا کہیں گذر نہیں، وہ حسن و عشق کے جملہ آداب و اطوار پر اظہارِ خیال کرتے ہیں، مگر جذبے کی طہارت، خلوصِ نیّت اور احساسِ رفعت ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتا ہے مزاج کی یہ شرافت و برگزیدگی، ان کی وہ خصوصیت ہے جس میں ان کے معاصر غزل گو بہت کم شریک ہیں بات ختم کرتے ہوئے پھر وہی بات کہنی ہے کہ شعرِ نشور کی اصل خصوصیت اس کی شعریت اور تغزّل کی بھرپور کیفیت ہے، انھوں نے زندگی اور زمانے، حیات و کائنات، فلسفہ و تصوّف، نفسیاتِ حسن و عشق جیسے بڑے اور اہم موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے مگر اس طرح کہ ان کی فکر، فکرِ محسوس اور ان کا خیال مجسّم معلوم ہوتا ہے، ان کی تشبیہات، ان کی پیکر نگاری میں زندگی کی حرکت و حرارت اور لطف و لطافت تازہ کاری اور شادابی ہر جگہ نمایاں ہے فکر و خیال کا کوئی پہلو ہو وہ ان کے یہاں وجدان و احساس کے سرچشمے میں غوطہ کھا کر ایک زندہ پیکر اور زندگی کا مظہر بن جاتا ہے اور اس میں فلسفہ کی خشکی اور تصوّف کی بے رنگی کی جگہ تغزّل کی شادابی، شعریت کی رنگینی، وجدان کی گہرائی اور احساس کی تازگی محسوس ہوتی ہے جو فن کی معراج کہی جا سکتی ہے۔

اب ان کے دو مجموعوں "فروغِ جام" اور "گل افشانیٔ گفتار" کے بعض متفرق منتخب اشعار ملاحظہ ہوں، جن کے پیشِ نظر ان کے فن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے:

ہم نہ برگِ گل، نہ شبنم نے خس و خارِ چمن
اے نسیمِ صبح جا، ہم خاکساروں کو نہ چھیڑ

اور ان کے بعد نشور واحدی۔

نشور واحدی صاحب کے سلسلے میں، ایک خاص بات یہ بھی خیال میں رہے کہ ان کا ذوقِ عمل بہت نکھرا اور ستھرا ہے جس میں لطافت و رعنائی اور رفعت و طہارت کی خاص کارفرمائی ہے اور ان کے حریمِ جمال و بارگاہِ خیال میں کثافت و آلودگی کا کہیں گذر نہیں، وہ حسن و عشق کے جملہ آداب و اطوار پر اظہارِ خیال کرتے ہیں، مگر جذبے کی طہارت، خلوصِ نیت اور احساسِ رفعت ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتا ہے مزاج کی یہ شرافت و برگزیدگی، ان کی وہ خصوصیت ہے جس میں ان کے معاصر غزل گو بہت کم شریک ہیں
بات ختم کرتے ہوئے پھر وہی بات کہنی ہے کہ شعرِ نشور کی اصل خصوصیت اس کی شعریت اور تغزل کی بھرپور کیفیت ہے، انھوں نے زندگی اور زمانے، حیات و کائنات، فلسفہ و تصوف، نفسیاتِ حسن و عشق جیسے بڑے اور اہم موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے مگر اس طرح کہ ان کی فکر، فکرِ محسوس اور ان کا خیال مجسم معلوم ہوتا ہے، ان کی تشبیہات، ان کی پیکر نگاری میں زندگی کی حرکت و حرارت اور لطف و لطافت تازہ کاری اور شادابی ہر جگہ نمایاں ہے فکر و خیال کا کوئی پہلو ہو وہ ان کے یہاں وجدان و احساس کے سرچشمے میں غوطہ کھا کر ایک زندہ پیکر اور زندگی کا مظہر بن جاتا ہے اور اس میں فلسفہ کی خشکی اور تصوف کی بے رنگی کی جگہ تغزل کی شادابی، شعریت کی رنگینی، وجدان کی گہرائی اور احساس کی تازگی محسوس ہوتی ہے جو فن کی معراج کہی جا سکتی ہے۔

اب ان کے دو مجموعوں "فروغِ جام" اور "گل افشانیٔ گفتار" کے بعض متفرق منتخب اشعار ملاحظہ ہوں، جن کے پیشِ نظر ان کے فن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے:

ہم نہ برگِ گل، نہ شبنم نے خس و خارِ چمن
اے نسیمِ صبح جا ہم خاکساروں کو نہ چھیڑ

صفحۂ شامِ الم پر یہ چراغوں کی لکیر
خونِ دل سے کوئی افسانہ لکھا ہے یہ بھی

ان سُرمگیں آنکھوں میں آنسو پسِ مژگاں ہے ؛ کچھ دُور اندھیرا ہے کچھ دُور چراغاں ہے
کچھ زمانے کی ہوا یوں تیز تر ہوتی گئی ؛ ہر کلی جو بے خبر تھی با خبر ہوتی گئی
حیات ایک قدم ہے نگاہ ایک ارادہ ؛ سفر تمام ہوا لیکن نظر تمام کہاں ہے
آخر کو منزلِ غمِ دوراں میں رہ گئی ؛ دو چار گام ساتھ مرے زندگی چلی
ہر ذرہ نشور ہے سفر میں ؛ کہنے کو یہاں قیام سا ہے
خیالوں کی دُنیا بھی اِک زندگی ہے ؛ وہ آئے نہیں اور آئے ہوئے ہیں

●●

شمس تبریز خان
502/13 مکارم نگر، لکھنؤ

محمد امیر شرر

نشور واحدی۔ ایک مطالعہ

رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں غزل اردو ادب کی آبرو ہے اور میرا خیال ہے اپنے ہمعصروں میں نشور واحدی غزل کی آبرو ہیں کیونکہ شعراء کی موجودہ نسل میں غزل کے رمز و ایما کے آداب کو جتنا انھوں نے سمجھا ہے اتنا کسی اور نے نہیں سمجھا۔ غزلوں میں نشتریت اور سادگی، سوز و گداز اور ترنم، فکر اور زورِ بیان، رومانیت اور موجودہ دور کے درد کو انھوں نے بہت شگفتگی سے برتا ہے۔ ان تمام اجزاء کو انھوں نے اس مہارت سے یکجا کیا ہے کہ "نشور کی غزل زندگی کی بڑی سجی سجائی جاگتی جگمگاتی تصویر نظر آتی ہے" ان کے کلام میں تشور نہیں آہستگی ہے، تبصرہ نہیں سلجھے ہوئے ذہن کا اشارہ ہے۔ ان کا غم دلوں کو مایوسی کے اندھیروں میں نہیں لیجاتا، چراغ نہ دامن بن جاتا ہے۔ ان کا عشق شباب کی نشاندہی کرتا ہے۔ شباب جو زندگی کا ثبوت ہے۔ اسی لیے ان کی رومانیت میں یاسیت اور رجائیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں روشنی کا مکمل شمع ہے جس کی روشنی میں اندھیرے اجالے لپٹے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر محمد حسن نے انھیں البیلا غزل گو کہا ہے۔

اتنے اجزاء کا کسی ایک شاعر میں جمع ہونا اسکی عظمت کا آئینہ دار ہے اسی لیے میں نے نشور واحدی کو غزل کی آبرو کہا ہے۔

ان کے یہاں غمِ دوراں بھی ہے اور غمِ جاناں بھی، حسن کی مصوری بھی ہے اور حالاتِ حاضرہ

کی عکاسی بھی۔ عشق کے معاملات بھی ہیں اور مصائبِ زیست کی واردات بھی، وہ نئے دور کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں لیکن ماضی کی بعض لذتوں اور لطافتوں کو یاد بھی رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات ہیں اور روایات کا احساس بھی، ان کے کلام میں اس دور کا کرب بھی ہے اور اس کا نشاط و نغمہ بھی۔ انکے چمن میں ہر رنگ کے پھول اور شیشے میں ہر رنگ کی شراب ہے۔ اپنے طور پر انھوں نے ہمارے دور کی روح کی نمائندگی کی ہے۔

اُنھوں نے آنکھ کھولی تو خود کو مشرقی سلاطین کے ایک اہم مگر قدیم تہذیبی و تمدنی مرکز کے کھنڈروں کے درمیان پایا۔ بلیا ضلع کے شیخ پور موضع کا یہ ہونہار بچہ اسلاف کی مزاروں اور منہدم خانقاہوں میں کھیلتے کھیلتے تھک کر جب کسی پرانی مسجد کی شکستہ محراب تلے بیٹھتا تو عالمِ خیال میں ہزاروں فانوس جل اٹھتے تھے۔ ان خانقاہوں سے مذہب و فلسفہ، شعر و ادب، تہذیب و تمدن کی نہ جانے کتنی داستانیں وابستہ رہی ہونگی۔ کچھ ہی دیر میں وقت کا ایک جھونکا ان فانوسوں کو بجھا کر رکھ دیتا اور بچے کے سامنے پھر وہی شکستہ محرابیں، وہی مزاریں اور خانقاہیں رہ جاتیں۔ آہستہ آہستہ یہی خیال جسم بنتا گیا اور اس میں ماضی کی کسک گھر کرتی گئی۔

وقت کی رہ گذر پر کھیل کے میدان سے درسگاہ تک یہ کسک انکا تعاقب کرتی رہی۔ مزاج بچپن سے شاعرانہ تھا تین چار سال کی عمر میں کئی خوبصورت نظمیں یاد ہو گئیں۔ ابتدائی تعلیم کے دوران میں ہی ذہن موسیقی کے آداب سے آشنا ہو گیا۔ آپ کے والد ماجد کو شعر و سخن کے علاوہ موسیقی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ گھر میں اکثر موسیقی کی محفلیں جمائی جاتیں اور رات گئے تک ساز و آواز کا جادو جگایا جاتا۔ ان کی شاعری میں غنائیت کا حسن شاید

اس علم کا مرہونِ منت ہے۔ ویسے تو بقول آل احمد سرور: "شاعری جذبہ کی موسیقی ہے اور اگر جذبہ کی تہذیب کے ساتھ مناسب زمین کا انتخاب، خوبصورت و شیریں الفاظ، دلفریب تشبیہات و تراکیب کا استعمال ہو تو شعر میں مخصوص نغمگی اور ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی خوبی و خصوصیت اور جذبات نگاری نشور صاحب کا حصہ ہیں"۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن نشور کی زمین سرمستی و سرشاری سے چور ہیں۔ وہ گاتی اور گنگناتی ہیں ــــ اور روانی بہار کی مست ہواہیں اڑتی ہوئی خوشرنگ تتلیوں کی یاد دلاتی ہے:ے

همہ گریہ سلک شبنم، همہ اشک بزم انجم — جو نہ گل بھی مسکرائے تو کہاں رہے تبسم
وہ نگاہِ ناز بھی ایسا کام کر گئی — شبنم حیات پر سو کرن کتر گئی
پیراہن رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے — معصوم ہے کیا جانے دامن کہیں جلتا ہے

غزل کے ان اشعار کے علاوہ ان کی بہت سی نظمیں جیسے "سرشار جوانی کا عالم"۔ "یہ رت یہ بسنتی رت"۔ اور "ساون" وغیرہ ان کی خصوصیات کی حامل ہیں۔

خوبصورت الفاظ کے استعمال اور زمین کے انتخاب کے علاوہ کبھی الفاظ کی تکرار سے کبھی مختلف الفاظ کی ہم آہنگی سے، کبھی نت نئی ترکیبوں سے اور کبھی تشبیہات سے ایک ماہر موسیقار کی طرح غنائی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

یہ سروقد، وہ ماہ رو، یہ شادماں وہ گل چکاں — نئی نئی جوانیوں کو دیکھنے تو الاماں
ادھر چلی، ادھر پھری، ادھر مڑی، ادھر گئی — لچک رہی ہو جیسے کوئی نرم شاخ گل چکاں
ہوا میں رس، فضا میں رس، رہ و گزر، دبوستاں میں رس — جوانیوں نے بھر دیا ہے جیسے کل جہاں میں رس
نئی نئی جوانیوں کی دل کشی نہ پوچھئے — نظر میں رس، لبوں میں رس، سخن میں رس، بیاں میں رس

یہ نیم باز تیری انکھڑیوں کے پیمانے　　　نظر ملے تو چھلک جائیں دل کے پیمانے

نظر نظر کو ساقی حیات کہتے آئے ہیں　　　ان انکھڑیوں کو میکدے کی رات کہتے آئے ہیں

ایک آنسو اور آہیں داستانِ صد ملال　　　کتنے دریا قطرۂ شبنم میں تھرّانے لگے

تراکیب اور تشبیہات کا اس طرح برتنا کہ ابہام اور الجھاؤ کے بجائے خواب آگیں اور کیف پرور تاثر پیدا ہو جائے انکے فن کی مہارت کا ثبوت ہے۔ وہ نقال نہیں بذات خود قابلِ تقلید ہیں۔ ان کی تراکیب اور تشبیہات کی کرنیں فن کے آئینہ پر پڑ کر کچھ ایسے خطوط اور رنگ میں ڈھل جاتی ہیں جو انکی شاعری کو لیونارڈو LEONARDO کی مونالزا سے کہیں حسین پیکر عطا کرتے ہیں۔ انکی مصوری میں رنگوں کی فراوانی کے بجائے ان کا مناسب و موزوں استعمال انکے فن کا دلآویز کرشمہ ہے۔ انکے اشعار گنگا جمنی تہذیب کے خوشنما محل ہیں جس میں دو تہذیبوں کی داستان فکر و فن کے دریچوں سے جھانکتی نظر آتی ہے ان محلوں کی تعمیر میں اجزا کی موزونیت اور ہم آہنگی انکے کمال کے آئینے ہیں جن میں زورِ بیان اور حسن بیان کے شفاف عکس دیکھے جاسکتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ کر گزرنے کا حوصلہ انھیں الہ آباد کے مدرسہ عربیہ مصباح العلوم تک لے آیا۔ عربی و فارسی ادب، تاریخ و فلسفہ، منطق اور طب کا درس لیا۔ فکرِ معاش کان پور لے آئی۔ پہلے ضیاء العلوم پھر کھنڑی کالج اور پھر حلیم کالج میں پڑھاتے رہے وہیں سے ریٹائرمنٹ لے کر کان پور کے ہو رہے۔ شعر و ادب ان کے ذہن میں رچا بسا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔

شیخ پور سے کان پور تک وہی ٹیس وہی کسک انکی ہمسفر رہی۔ شکستہ خانقاہوں

کی محرابیں، مزار اور مسجدیں اور اجڑی ہوئی بستی کی ویران گلیاں ذہن کے دروازوں پر دستک دیتی رہیں، صدیوں کے ربط سے تہذیب کی جو جنّت بنی تھی، اسکے مٹنے سے اخلاق اور اقدار کا جو نقصان ہوا تھا اسکا شدید احساس انکے یہاں ملتا ہے۔

مٹے ہوؤں کے فسانے چمک رہے ہیں تمام ؛ زمانہ اپنے شہیدوں کو بھولتا بھی نہیں

کان پور اور الٰہ آباد کی مادیت نے انکے ذہن کو اور جھنجوڑا اور انکا احساس اور شدت اختیار کر کے اُن نظموں کے پیکر میں ڈھل گیا "میرے لیے کیا ہے کچھ بھی نہیں"۔ "نادارو کی عید" "اخبار نویس اور خون میں پانی" جو انکی بہترین نظمیں ہیں جو انکے طرزِ فکر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی فکر ماضی اور حال کی کشمکش اور داخلی وخارجی تجربات کا نتیجہ ہے۔ اسلیے جب وہ صنعتی ترقی کے پس منظر میں انسان کے تہذیبی اثاثے کو لٹتا ہوا دیکھتے ہیں تو انکی فکر دردمند دل کی آواز بن جاتی ہے

ہزار شمع فروزاں ہو روشنی کیلئے ؛ نظر نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کیلئے

نشورؔ صاحب موجودہ دور کے اہم شاعر ہیں کیونکہ ان کے خیالات میں گہرائی، جذبات میں خلوص اور اظہار میں کیفیت ہے۔ موضوع میں قوس وقزح کی سی دلآویزی اور رنگارنگی ہے۔ انکی تعلیم وتربیت نے انھیں نظامِ اخلاق اور شیوۂ زندگی عطا کی اور تجربات نے فکری رجحانات کو قوی تر کر دیا۔ انکی فکر دھندلا سا دیا نہیں جو ذہن اس کی مدھم روشنی میں بھٹکتا رہے ان کی فکر شعلۂ جوالہ ہے جس کی آنچ موجودہ نظام کے ڈھانچے کو جلا ڈالنے پر آمادہ ہے۔ ان کے جذبات میں گرمی بھی ہے اور خلوص بھی۔ یہی خلوص اور جذبہ دردمند انسانیت کا خزانہ ہے۔ وہ لٹتی ہوئی جنّت بکھرتی ہوئی تہذیبی بساط اور جاتے ہوئے

کارواں کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کا قلم نشتر بنجاتا ہے جس سے وہ زندگی کی قدروں کو آلودگی سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ انکا یہ جذبہ اچھی شخصیت اور ایماندار شاعر کا جذبہ ہے اسی جذبہ کے آئینے سے ایسی شعائیں پھوٹتی ہیں جو ہمارے ذھن اور اور ہمارے دور کا اجالا بن جاتی ہیں۔

رہبر منزلِ خرد ایسی بھی کیا ترقیاں — ہونٹ سے گر پڑے ہنسی آنکھ سے پیار چھوٹ جائے
شمعِ کہنہ سے تری بزم تو ہے ضو فشاں — سو چراغ جل اٹھے لو جدھر جدھر گئی
مخلصانِ بے خبر دورِ مہر و ماہ میں — شمع ڈھونڈتے رہے روشنی گذر گئی
ہے چمن کی آبرو قافلہ بہار کا — لوٹ کے گل کا ساتھ کیا بے وفا جدھر گئی
اندھیروں کے پیچھے قدم رکھنے والو — ٹھہر جاؤ پہلی کرن پھوٹ جائے

کسی بھی شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے افکار کو شاعرانہ اظہار کے سانچے میں ڈھالکر پیش کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا افلاطون، کانٹ اور ہیگل تو ہو سکتا ہے میر، غالب یا حسرت نہیں بن سکتا۔ نشور صاحب کے یہاں فکر کا شاعرانہ اظہار بہت خوبصورت انداز میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں اظہار کا حسن فکر کو ماند نہیں کرتا اس کی تابانی اور چمکا دیتا ہے وہ آجکل کے شعراء کے لیے اچھے موڈل ہیں کیونکہ افکار کی تصویر کشی میں اظہار کے خطوط کو ایسے فنکارانہ ڈھنگ سے استعمال کرتے ہیں کہ فکر کا پیکر مکمل طور سے ابھر آئے۔

ان کے تغزل کا قالب و لہجہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ الفاظ کے برمحل استعمال اس کی آواز اور گونج تھرتھراہٹ اور ارتعاش سے ترنم پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ الفاظ کی چمک دمک کو شعر کی اسپرٹ پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔

جذبات کو تاثر آمیز ڈھنگ سے پیش کرنے کے آرٹ سے واقف ہیں۔ ان کے یہاں بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک نہیں ملتی بلکہ پھوار کی دلآویزی اور ترنم نظر آتا ہے۔ وہ نرم اور کرخت کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ ان کے فن کا جادو فوراً اثر کرتا ہے لیکن الفاظ کے پردے میں وہ جادو کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ان کے فن کا اعجاز ہے۔

■■

محمد امیر شرر
شیش محل محلہ سرائے شیخ
اِٹاوہ۔ یوپی

پیام فتحپوری

نشور واحدی
غزل کے 'نغزگو شاعر'

حضرت نشور واحدی مشہور و معروف شاعر ہیں. اب تک ان کے دس شعری مجموعے اور تین نثری تخلیقات شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں. ان کی غزلوں کے بہترین اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں، ملک اور بیرونِ ملک کے مایہ ناز مشاہیر نقادوں نے انھیں خراجِ تحسین سے نوازا ہے.

نشور صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام ۲۷ سال کی عمر میں شائع ہوا. کلام کی بلندی اور پختگی نوعمری میں حیرت انگیز ہے، اس میں اسلامی طرزِ فکر کی نظمیں اور آخر میں غزلیں بھی شامل ہیں. نظمیں ثقہ حضرات کی توجہ کی مستحق ٹھہریں. غزلیں خاص و عام قارئین میں دل پسند اور مقبول ہوئیں. ان میں اکثر غزلیں جو عارفانہ، متصوفانہ، رندانہ، عاشقانہ اور کیفیات میں ڈوبی ہوئی خمریاتی غزلیں بھی ہیں، خواجہ حافظ اور خیام کے رنگِ سخن کی یاد دلاتی ہیں. ان غزلوں کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے :

یہاں سجدہ وہاں سجدہ معاذ اللہ دیوانہ　　　نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بت خانہ

معاذ اللہ میخانے کے اورادِ سحر گاہی　　　اذاں میں کہہ گیا میں ایک دن یا پیرِ میخانہ

خمریاتی غزلوں کے بھی کچھ اشعار سنئے :

کبھی سنتے ہیں عقل و ہوش کی اور کم بھی پیتے ہیں　　　کبھی ساقی کی نظریں دیکھ کر ہم بھی پیتے ہیں

کوئی کہتا ہے مسجد ہے کوئی کہتا ہے باہر جا ؛ الٰہی کیا میں بھولا ہوں رہِ میخانہ مستی میں

نشور کی ایسی غزلوں کا انداز، جگر، فراق اور جوش کی رندانہ شاعری سے مختلف اور منفرد ہے اور جدت آفریں ہے۔ میں نے ان غزلوں کے اشعار اس لئے پیش کئے ہیں تاکہ قارئین اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ ابتدا میں ان کی غزلیہ شاعری کا رنگ کیا تھا اور آگے چل کر وقت (زمانہ ماحول) کے تبدیل ہونے کے ساتھ ان کے کلام میں جو تبدیلی آئی وہ کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد ارتقاء تک پہونچیں اور نشور نے ممتاز و مقبول غزل گو شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

۱۹۳۹ء کے قبل ہی سے آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی، اور ساتھ ہی ترقی پسند مصنفین کی تحریک بھی۔ نشور صاحب نے ترقی پسندوں کے انقلابی قافلے میں شریک ہو کر سیاسی انقلابی نظمیں کہیں، اور عوام میں آزادی کے لئے جوش بیداری پیدا کی اور مقبولیت حاصل کی۔ رومانی انسان دوستی کے رنگ کی نظمیں بھی اسی دور میں تخلیق کیں، اور ان کی غزلوں میں ادب برائے زندگی کی ترجمانی بھرپور نمایاں ہونے لگی۔ یہ نظمیں غزلیں ۱۹۴۶ء میں "آتش و نم" میں شائع ہوئیں فراق صاحب "آتش و نم" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔ یہ مجموعہ ترقی پسند ادب میں گراں بہا اضافہ بھی ہے اور ایک شگون بھی ہے۔ نشور کی شاعری محض شکایتِ زمانہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے امکانات اور نئے آفاق اور کائنات کی طرف اشارے بھی کرتی ہے۔ نشور کو نظم و غزل دونوں میں بڑی قدرت حاصل ہے۔ اس تبصرے میں صرف ان کے تغزل کے بارے میں اپنے خیالات و تاثرات پیش کرتا ہوں۔

حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنے عہد کے مسائل اس کے اثرات سے پیدا ہونے والے جذبات احساسات مشاہدات تجربات کا ترجمان ہو۔ ان کی غزلیہ شاعری کی فضا بہت وسیع ہے آفاق حیات و کائنات سے ان کی شاعری کا رشتہ استوار ہے۔

ان کا کلام منفرد ہے، اور بقولِ غالب:

"کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے"

کا مصداق ہے، ان کے کلام میں کسی ہم عصر یا کسی اور شاعر کی تقلید اور نقالی نہیں ملتی ہے۔

وقت (زمانہ) کے انقلاب اور ماحول کے تغیرات کے مسائل بھی ان کی غزلوں میں شامل ہوتے گئے اور ان کی غزلیں دلکش سے دلکش تر ہوتی گئیں، اور ان کا جدید اندازِ تغزل نئے پیراہن کے ساتھ تاثر اور سوز و گداز کے سانچے میں ڈھلتا گیا، ان کی غزلیں، رنگا رنگ خیالات و جذبات کا مرقع ہیں، یا قوسِ قزح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ان کے اشعار کا اچھوتا پن اور حسین فکر و تخیل کا اثر دلوں کو چھو لیتا ہے، اور دلوں پر دیرپا نقوش چھوڑتا ہے، اشعار کی کیفیت دل و دماغ پر چھا جاتی ہے، یہی ان کے کلام کی مقبولیت کا راز ہے۔

•

نشور صاحب کے ان گنت معیاری اشعار کو اس مختصر تحریر میں زیرِ بحث لانا ممکن نہیں لیکن کچھ اشعار مختلف رنگوں اور موضوعات کے پیش کرتا ہوں جو ان کی نغز گوئی کی دلکش تصویر ہیں۔

معصوم ہے کیا جانے دامن کہیں جلتا ہے ٭ پیراہنِ رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے

منزلوں کی بات ہے رستے میں کیا کہوں ٭ میں ابھی سے کس طرح ان کو بے وفا کہوں

چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے ٭ دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے

وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بنائے خونِ جگر پڑی ٭ مرا دل نہ تھا الم آشنا کہ تری ادا پہ نظر پڑی

تو شراب گر پیئے تجھ کو پارسا کہوں ٭ اے حریصِ میکدہ خونِ زندگی نہ پی

ان کی غزلیں زمانے کے تغیرات کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرتی گئیں اور شہرت کا آفتاب عروج پر آیا۔ ریڈیو، ٹی وی، مجموعوں کی اشاعت سے، ان کی مقبولیت ہندستان کے باہر کراچی اور ڈھاکہ

تک پہونچی تو وہاں کے مُشاعروں میں بھی بار بار شرکت کی، ان کے کلام کو قدر و منزلت کے ساتھ نوازا گیا اور وہ بے حد مقبول ہُوئے۔

ماحول اور عہدِ حاضر کے مسائل کی ترجمانی حقیقت پسندانہ مشاہدات اور تجربات کو پیش کرتے ہیں۔ نشور، صرف اچھے شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے، جو اپنوں اور دُوسروں کے دُکھ درد کا احساس رکھتے تھے ۔

شاید کہ نظر پہنچے تیری غمِ انساں تک ✣ اے صبحِ چمن پرور چل شامِ غریباں تک ✣

اُن کے اشعار میں عہد بہ عہد بدلتے ہوئے ماحول کے تغیرات سے پیدا ہونے والے مسائل اور اس کے اثرات، نیز سیاسی، سماجی، انسانی ہمدردی کے جذبات کی ترجمانی ہے جس نے ان کی شہرت اور شاعرانہ عظمت میں چار چاند لگا دیئے ہیں انھوں نے حقیقت پسندانہ مشاہدات، تجربات کو شعر میں خوبصورت پیرہن اور حسین اندازِ بیان میں ادا کیا۔

وہ حُب الوطنی کے جذبے سے بھی سرشار نظر آتے ہیں، وطن سے محبت کرنے والوں اور وطن کی خدمات اور وطن پر قربان ہونے والوں کی ترجمانی فخریہ انداز میں کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

ہر ذرّہ خاکی کو کرن ہم نے بنایا ✣ مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا
اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی ✣ اپنے لئے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا
تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں ✣ اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

اس قبیل کے سیاسی رنگ کی پوری پوری غزلیں ملیں گی، میں چند ہی اشعار پر اکتفا کر رہا ہوں، ورنہ بیشتر اشعار ایسے ہی ملیں گے جو قابلِ تعریف ہیں

قادر الکلامی ہر راہ میں ہے گنجِ شہیدانِ انقلاب ✣ وہ وقت ہے کہ سنگ اُٹھاؤ تو سر ملے

آزادی کے بعد ہونے والے فسادات، کشت و خون اور بے گناہ انسانوں پر ہونے والوں کی تاریخ، ایک

شعر میں بہت ہی مؤثر انداز میں بیان کر دی ہے ـــــ "وہ وقت ہے کہ سنگ اُٹھاؤ تو سَر ملے"
کیا کہنا ہے آپ اپنی مثال ہے ـــ قادرالکلامی کی ایک اور مثال ؎

اے مسافر! اے مہاجر! اے اسیر! ؛ اے مرے شاہِ ظفر تجھ پر سلام

پہلے مصرعہ میں مسافر مہاجر اور اسیر کہنا، اور دوسرے مصرعہ میں اے مرے شاہِ ظفر کہہ کر تجھ پر سلام کہنا، ایک ایسی مثال ہے جس میں سحرِ حلال کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

تمثیلی شاعری

نشور کی تمثیلی شاعری، اچھوتی، انوکھی اور نرالی تشبیہات سے سجی نیز ہندوستانی رُومانی کلچر سے مزیّن ہے۔ ان کی تشبیہات جوش اور فراق کی تشبیہات کے انداز سے مختلف اور منفرد ہیں، ان کے اشعار دِلوں پر ایک نیا تاثراتی سرور دیتے ہیں۔ ایسے اشعار ان کے کلام میں بہت ہیں، مگر چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

گزرے ہوئے دِلکش لمحوں کی بھولی ہوئی یاد ایسی آئی!
جیسے کوئی پیتم پردیسی سوتے میں اچانک آ جائے

جب پہلے پہل محسوس ہوا اے حسن، تو دل ایسا کانپا ؛ جیسے کہ دُلہن پہلی شب کی آہٹ جو ملے تھرّا جائے!

دُوسری غزل کے اشعار: کھوئی سی تمنّا اُلفت کی، یوں پہلے پہل دِل میں آئی
جیسے کسی شادی کے گھر میں دولھن اُترے بھولی بھالی

پھیکا ہے جوانی کا عالم جب دل کی رگوں میں خون نہ ہو
جیسے کہ سحر ہو ہولی کی اور رنگ سے ہو تل خالی

یوں جانِ تمنا سے مل کر آتے ہیں نشور اُمڈے آنسو ؛ جیسے کہ عدالت کے آگے بے باک ہو مجرم اقبالی

ڈاکٹر محمد حسن، مجموعۂ کلام "سوادِ منزل" میں "البیلا غزل گو" عنوان کے تحت کہتے ہیں:

"نشور کو نئی تراکیب اور تشبیہات بہت عزیز ہیں اور اس لئے قدیم ایشیائی تہذیب کا اُنھیں برتنا خاصے

ہیں، وہ کہتے ہیں ۔" غالب نے کہا تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں ہے، معنی آفرینی ہے، جو غزل کی جان ہے نشور کی غزلوں میں نغز گوئی کی مثالیں ملتی ہیں، ان کی غزلیں سجیلی ہیں، بناوٹی نہیں، ان میں آرائش ہے تصنع نہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی شاعری کی آبیاری خونِ جگر سے کی ہے فکر و نظر، البیلاپن، رنگینی و سرمستی، قادر الکلامی کے اچھوتے اشعار ملتے ہیں۔"

اب میں ایسے اشعار پیش کر رہا ہوں جو غیر مطبوعہ ہیں، ہر شعر ان کے اچھوتے خیالات اور جذبات کا آئینہ ہے اور اس آئینے میں کلام کی خصوصیات اور محاسن نمایاں طور پر نظر آئیں گے جو ان کی کمالِ نغز گوئی کی غیر معمولی مثال ہیں:

جہانِ نو میں بھی اہلِ ستم نہیں بدلے ٭ خدا بدل گئے لیکن صنم نہیں بدلے

کوئی ہو قافلہ راہِ جنوں وہی ہے نشور ٭ قدم بدل گئے، نقشِ قدم نہیں بدلے

نالہ نغمہ ہو گیا میری زبان کے فیض سے ٭ حسنِ فطرت نے عطا کی، وہ گل افشانی مجھے

سرحدِ انسانیت سے دور ہے ہر کارواں ٭ راہبر کوئی نہیں، دنیا بھٹکتی جائے ہے

تیرے نالے بے اثر ان کا تبسم دلخراش ٭ ایک ننھی آواز اردو کی وہ بھٹکتی جائے ہے

نظر پھیرے ہوئے ملتا ہے رستے کا ہر اک ساتھی
جسے ہم دوست سمجھے تھے نظر دزدیدہ ہے وہ بھی

جو سماج آج ہے کل نہ تھا، جو مزاج کل تھا وہ اب نہیں ٭ کسی اک نظامِ حیات کو جو ثبات ہو تو بتائیے

وہیں دور ہو سکے گی غم و درد کی گرانی ٭ کسی میکدے میں چلئے جو بچی ہو عمرِ فانی

اہلِ خرد کا کام ہے تفریقِ کارواں ٭ انسانیت کی راہ میں دیوار اٹھا گئے

ایسے بے شمار غیر مطبوعہ کلام ان کے زیر طبع غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام میں ملیں گے جو عنقریب اشاعت پذیر ہوگا اور یقین ہے کہ مقبول ہوگا۔

میں اس بات کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اب تک ان کے کلام پر جو کچھ بھی نقاد حضرات نے تبصرہ کیا ہے، اس میں بہت سے پہلو اور محاسن نظر انداز ہونے کی وجہ سے روشنی میں نہیں آسکے مقتدر اہلِ قلم نیز صاحبِ نظر سے گذارش ہے کہ ان کے کلام کا تفصیلی مطالعہ کرنے اور تمام پہلوؤں نیز اُن کے محاسن کو اُجاگر کریں تاکہ قارئینِ ادب کو ان کی شاعری کی قدر و قیمت اور اس کے محاسن کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ ▲▲

پیام فتحپوری
۲۰/۶ نگر مہاپالیکا کالونی فہیم آباد۔ کان پور

مورخہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء

نامی انصاری

شاعرِ شیریں نوا

علامہ نشور واحدی (۱۹۱۲ء تا ۱۹۸۳ء) اعلیٰ درجے کی تخلیقی توانائی سے معمور ایک ایسے شاعر تھے جن کا کلام نہ صرف اُن کے دور میں بلکہ آج بھی برگِ گُل کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ نظر آتا ہے۔ اُن کے اشعار میں ایک ایسی نغمگی اور کیف آور حسن ہے جو احساسات و جذبات کے تاروں کو چھُو لیتا ہے اور ذہن و دل کو غنائیت اور مسرت سے معمور کر دیتا ہے اُن کی غزلوں میں جو نفاست اور شائستگی ہے وہ اُن کی کڑھی ہوئی مہذب شخصیت کا پرتو ہے اُن کے شاعرانہ کمالات کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ یہ ہے کہ اُن کی پوری شاعری میں ابتذال اور ہلکے پن کا شائبہ تک نہ ملے گا فکر و معنی کی سطح روشن سے روشن تر ہوتی چلی جاتی ہے

نشور واحدی کی شاعری کی اُٹھان کا زمانہ وہ ہے جب اُردو شاعری کے میدان میں جوش، جگر، فراق، ساحر، مجاز، روش، احسان دانش اور حفیظ کا طوطی بول رہا تھا لیکن چاند تاروں کے اس ہجوم میں بھی بہت جلد نشور نے اپنی آواز و انداز کا اعتبار قائم کر لیا ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ جس طرح عوامی مشاعروں کے بے حد مقبول شاعر تھے، اور لوگ اُن کے کلام پر سر دھنتے تھے، اسی طرح خاصان ادب کے حلقوں میں بھی ان کا کلام

معتبر اور محمود تھا۔ نشور واحدی کا ترنم ہندوپاک میں مشہور تھا لیکن کاغذ پر چھپنے کے بعد بھی اُن کی نظموں اور غزلوں میں ویسی ہی کشش محسوس ہوتی تھی جیسی کشش اُن کا کلام اُن کی زبان سے سُن کر محسوس ہوتی تھی اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ مشاعروں کے شاعر اپنا کلام چھپوانے سے گریز کرتے ہیں اور چھپنے والے شاعر مشاعروں سے دُور ہی دُور رہتے ہیں۔ جگر مُرادآبادی اور نشور واحدی نے اس دوئی کو مٹا دیا تھا۔ ان کے کلام کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں یعنی صہبائے ہند، شورِ نشور، آتش و نم، فروغِ جام، گُل افشانیٔ گفتار اور سوادِ منزل۔ اب یہ کتابیں تقریباً نایاب ہیں، ماسوائے صہبائے ہند اور آتش و نم کے، جن کو ان کے لائق فرزند جناب نیاز واحدی نے دوبارہ چھپوایا ہے۔

نشور واحدی کی شخصیت کا ایک تابناک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عربی و فارسی کے عالم تھے تصوّف اور فلسفے سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ تاریخ فلسفۂ خودی (ایشیا میں) ان کی ایک گراں مایہ نثری تصنیف ہے جس کا دوسرا حصّہ "ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء" کے نام سے نیاز واحدی نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا ہے۔ ان کی ایک اور مختصر کتاب "دانشِ آخر الزّماں" ۱۹۶۶ء میں ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئی تھی، جو تصوّف کی اصطلاحات اور قرآنی علوم کی مبادیات کے جائزوں پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے حضرت نشور واحدی کی تہ در تہ علمیت کے ایک ایسے پہلو کا پتہ چلتا ہے جس سے لوگ عموماً ناواقف ہیں، وہ وارداتِ قلبیہ کے رمز شناس اور جادۂ تصوّف کے مزاج آشنا تھے لیکن خود کو چھپائے رکھتے تھے اور دوسروں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے تھے، حد یہ ہے کہ ان کے بعض اشعار کی وجہ سے لوگ ان کو سچ مچ کا میخوار سمجھنے لگے تھے۔

نیاز واحدی کا ذکر آ گیا ہے تو میں عرض کروں کہ کسی شاعر کو ایسے لائق فرزند مشکل ہی سے ملتے ہیں جیسے کہ نیاز واحدی ہیں، اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے والد کی ادبی وراثت کا کمال جاں فشانی سے تحفظ کیا ہے بلکہ ان کی زندگی کا مشن ہی نشور واحدی کے بارے میں لکھے گئے ایک ایک لفظ کو محفوظ کر لینا ہے. کانپور کے اہلِ علم اور ادب دوست بخوبی جانتے ہیں کہ اُس دور کے دیگر نامور اور اُستاد شعراء کا کلام کس حد تک ان کے وارثین کے یہاں محفوظ رہ گیا ہے؟

بہر حال یہ موقع علامہ نشور واحدی کے گوناگوں شاعرانہ کمالات پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اُردو ادب کے ایک خادم کا اُس دور کے ایک باکمال شاعر کو محض خراجِ عقیدت ہے ۔ کانپور کی سرزمین سے اُبھرنے والا یہ طرح دار و خوش گفتار شاعر اور صوفی و مفکر اپنے پیچھے جو علمی و ادبی سرمایہ چھوڑ گیا ہے، اس سے نہ صرف اُردو زبان ثروت مند ہوئی ہے بلکہ اس سے کانپور کا نام بھی روشن ہوا ہے.

(علامہ نشور واحدی کی ۱۳ ویں برسی پر ایک ادبی تقریب میں پڑھا گیا)

۵ جون ۱۹۹۷ء — نامی انصاری

۹۹/۲۹۵
نالہ روڈ، چمن گنج کانپور

نشورؔ واحدی کی شاعرانہ شخصیت

ماضی قریب کے دورِ شاعری میں حضرت نشورؔ واحدی کی شخصیت ایک منفرد مقام کی حامل ہے اور کئی حیثیتوں سے قابلِ ذکر ہے۔ باخبر حضرات جانتے ہیں کہ وہ مشرقی علوم سے آگاہ ہوتے ہوئے اردو شاعری میں ایک عہد آفریں اسلوب کے قابلِ رشک علم بردار ہیں، ادبِ قدیم اور ادبِ جدید کے تمام گوشے ان کی شاعری میں بطورِ خاص شخصیت کی آئینہ برداری کرتے ہیں۔ وہ بھرپور شاعرانہ مزاج کے مالک ہیں۔ اُن کی شاعری کا لہجہ ہر دور میں امتیازی شان رکھتا ہے، وہ علمی استعداد رکھنے کے باوجود نہایت صاف اور سلیس بیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ طرحی مشاعروں کی شرکت میں اپنے فطری اندازِ کلام کو نہیں بھولتے۔

کسی مضمون کو نظم کر لینا کسی مشاق شاعر کے لئے دشوار امر نہیں مگر احساسات اور جذبات کی ترسیل میں شاعرانہ نیور کو برقرار رکھنا مشکل ترین مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں کتنے ہی راہرو گمراہ ہو کر شاعری کی روح پر ظلم کرتے ہیں، لیکن یہ شاعرانہ صلاحیت قدرت نے حضرت نشورؔ واحدی کو وافر طور پر عطا کی ہے۔ ان کا ترنم بے مثال ناقابلِ تقلید، اور ان کا کلام بے مثال ناقابلِ تردید ہے — اب کہاں لوگ اس طبیعت کے۔

میں عرصے سے بیمار ہوں، مطالعہ اور تحریر کا حق ادا نہیں کر سکتا، تاہم میں حضرت نشورؔ واحدی کی شاعرانہ عظمت پر چند سطور قلمبند کرنے کی ہمت کر رہا ہوں۔ یہ عنوان بڑی وسعت اور مکمل

شرح و تفصیل چاہتا ہے، افسوس کہ حسب منشاء وقت نہیں، دماغ و دل ایسے تھکے ہوئے ہیں کہ تبصرہ کا فرض منصبی پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا۔

نشور واحدی ایک نوع پسند اور جدت آفریں شاعر ہیں، ان کے اشعار میں جو گیرائی اور گہرائی ہے وہ اشاروں کے دائرے میں نہیں سما سکتی۔ میں نشور واحدی کو ایک فطری، اور صاحب صلاحیت سخن سنج اور خلاق معانی شاعر سمجھتا ہوں۔ سردست میرے پاس ان کا کوئی مجموعۂ کلام نہیں جس کے سہارے مفصل تبصرہ کر سکوں، فی الوقت موصوف کے کچھ اشعار فکر و خیال پیش کر رہا ہوں:

کوشش نہ کر کہ جان چمن سے نظر ملے ؎ پھولوں پہ کر نگاہ کہ خون جگر ملے

کچھ گرد بھی اٹھتی ہے جب قافلہ چلتا ہے ؎ عنوان ترقی ہے یہ تیرہ فضائی بھی

دور تک نکہت گل خاک اڑاتی آئی ؎ پنکھڑی ایک گلستاں سے صبا کیا لائی!!

یہ کسی معمولی شاعر کے بس میں نہیں کہ ایسا شعر تخلیق کر سکے، اور بھی ملاحظہ فرمائیے:

اک رات گذرنے کا عالم نظر آتا ہے ؎ گیسو جو پس شانہ برہم نظر آتا ہے

"رات گذرنے کا عالم" کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ پرانے دور کے یہ شعر بھی دیکھئے:

پیمانہ بہ پیمانہ میخانہ بہ میخانہ ؎ پہنچا دیا ساقی نے پایان حقیقت تک

گذرے ہوئے دلکش لمحوں کی بھولی ہوئی یاد ایسی آئی!

جیسے کوئی پیتم پردیسی سوتے میں اچانک آ جائے

یہ بیان و اظہار اردو والوں کیلئے قابل رشک ہے، اور ملاحظہ فرمائیں:

وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بنائے خون جگر پڑی ؎ مرا دل نہ تھا الم آشنا کہ نزی ادا پہ نظر پڑی

نہ جنوں کی راہگذر ملی نہ خرد کی راہ گذر پڑی ؎ مری زندگی تھی کہ منزل تب و تاب غم میں اتر پڑی

ترا کام سیر مدام ہے، نہ کہ گلستانوں میں ٹھہرنا ؛ یہ کلی کلی کے فریب میں، تو کہاں سے بادِ سحر پڑی

اور ایک ان کی نہایت مشہور غزل ہے جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہمہ گریہ مسلکِ شبنم، ہمہ اشک بزم انجم ؛ جو نہ گل بھی مسکرائے تو کہاں رہے تبسم

یہ ادائے ملتفت ہے، کہ حجابِ کم نگاہی ؛ ترے رخ پہ رنگ رخ کا یہ تھکا تھکا تلاطم

جسے غم سے کچھ ملا ہے وہی ہم نفس ہے میرا ؛ جو شکستہ سازِ دل ہو تو سنو مرا ترنم

یہ سمجھ لو زندگی ہے سفرِ ہزار جادہ ؛ غمِ کارواں سے چھوٹے تو نشورؔ کھو گئے تم

اب میں چند وہ شعر پیش کرنا چاہتا ہوں جنھیں نشور صاحب نے ریڈیو، ٹی وی وغیرہ میں پڑھے اور کچھ رسالوں میں چھپے لیکن باقاعدہ ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہیں، عزیزم نیاز واحدی کی سعی و سعادت مندی سے غالباً وہ نشور صاحب کی آئندہ اشاعتوں میں آجائیں۔ ملاحظہ ہوں:

اہلِ دانش روشِ عام سے آگے نہ گئے ؛ انتظارِ سحر و شام سے آگے نہ گئے

منزلِ آگاہ نشورؔ، اہلِ سخن تھے لیکن ؛ وہ بھی شورِ دلِ ناکام سے آگے نہ گئے

اپنی ہی خطا کا دنیا میں انسان نشانہ بنتا ہے ؛ اپنی ہی کماں، اپنا ہی جگر یہ تیر کہاں لے جائے کوئی

ملبوسِ حریری سے ان کے رنگین کرن چھنتی ہی رہی ؛ وہ چاند چھپالیں دامن میں تنویر کہاں لے جائے کوئی

موت آئے تو اس کی خبر بھی نہ ہو ؛ زندگی وہ ہے جو جان لے کر ٹلے

حوصلہ کام آتا ہے لیکن نشورؔ ؛ شاعری چاہتی ہے نئے ولولے

جلالے اپنے دیئے بادِ تند سے پہلے ؛ کبھی تھمی ہوئی آندھی کا اعتبار نہ کر

جہاں نہ ہو ادب و شعر و حسن کی محفل ؛ وہاں نشورؔ کے نغموں کا انتظار نہ کر

بے لذتِ غم بے جہدِ پیہم ؛ آرام میں بھی آرام مشکل

پھولوں کو مجرم کہنا ہے مشکل ؛ موجِ صبا پر الزام مشکل

...

کوثر جائسی
۱۲۸/۱۲ کرنیل گنج۔ کانپور

۱۴؍ مارچ ۱۹۹۹ء

شمیم عثمانی

نشور شناسی

ایک گفتگو

نشورؔ صاحب کو میں نے تین قسطوں میں جانا۔ پہلا وہ زمانہ جب میں شاعری کو کوئی الہامی چیز اور شاعر کو فوق الفطرت سمجھتا تھا۔ یعنی شعر پڑھتا تھا، سنتا تھا، شاعر بھی کبھی کبھار دیکھنے کو مل جاتے تھے۔ مگر مذکورہ خیال بچپن ہی سے دل میں ایسا بیٹھا ہوا تھا جس نے ایمان و ایقان کی شکل اختیار کر لی تھی، ان دنوں میں نے نشورؔ صاحب کے کافی شعر پڑھے اور سنے تھے اور انھیں ایک آدھ بار دیکھا بھی تھا۔
پھر دوسرا دور آیا جب یہ کفر خیال ٹوٹا اور اوٹ پٹانگ شعر میں خود بھی موزوں کرنے کی کوشش کرنے لگا تب بھی، مجھے یاد ہے، بڑے شاعروں کو دیکھ کر یوں محسوس کرتا تھا کہ من جانب قدرت یہ شاعری کی ایک ایسی ڈگری لے کر آئے ہیں جو اب مجھے یا مجھ جیسے کسی اور کو نہیں مل سکتی ۔۔۔ یونیورسٹی بند ہو چکی ہے اور اب کھلے گی بھی نہیں۔ (حالانکہ یہ گمان کچھ شاعروں کو دیکھ کر آج بھی ہوتا ہے۔)
تب میں نشورؔ صاحب کو شاید کئی بار دیکھ چکا تھا۔ کبھی سر راہے، کبھی مشاعروں میں شعر پڑھتے ہوئے
تیسرا اور آخری عہد وہ شروع ہوا جو آج تک قائم ہے اور اس دور کی اہم بات یہ کہ میں نے اس زمانے میں نشورؔ صاحب کو صرف سنا ہی نہیں بلکہ سنایا بھی۔ اس بات سے میں آج بھی خوش ہوں بہت خوش۔ غرض کرنا یہ ہے کہ موصوف کی شخصیت مجھے ان تینوں ادوار میں پرکشش اور اچھی لگی۔ ہر چند کہ وہ جسمانی اعتبار سے نحیف الجثہ اور شکل و صورت میں کوئی خاص شخصی وجاہت نہ رکھتے تھے، تاہم اپنی

خوش قامتی اور خوبصورت آنکھوں کے اگر وہ دعوے دار ہوتے تو کوئی تکلّف برطرف کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ دانت قدرے بڑے اور سکوت کے عالم میں بھی زیر یں لب بوس رہتے تھے اور بالآخر زندگی کے آخری چند برسوں میں اس گستاخی کا جواب دنداں شکنی نے دے ہی دیا۔ لیکن ان کے ترنم میں تاحیات کوئی فرق نہ آیا۔ ترنم سے پڑھنے والے شاعروں میں گنتی کے چند ہی کو میرے ذوق سماعت نے پسند کیا جن میں نشور صاحب بطورِ خاص اپنی افزکبل صوت وصدا کے باعث اور موسیقیت سے متعلق راگ راگنیوں سے مبّرا ہونے کے سبب بے انتہا پسند آئے۔ کچھ شاعروں نے ان کا اندازِ ترنم اپنایا بھی مگر — اصل اصل ہے۔

چہرے میں خاص کشش بیں نے موصوف کی آنکھوں میں محسوس کی جن کا غیر معمولی طور پر بڑا اور چمکدار ہونا کوئی ایسی خاص بات نہ تھی، جادوگری تو صرف ان میں کوئی تجسس، کسی تلاش کا ہمہ وقت ہونا تھا جو خوب سے خوب تر والی بات سے ماورا، کوئی اور شئے تھی اور جسے محفل وتنہائی میں ہمیشہ ہی میں نے محسوس کیا۔ رہی پوشش کی بات تو مرحوم کو میں نے ہر موسم میں کرتا، پاجامہ (لمبی مہرلوں والا) اور شیروانی میں ہمیشہ دیکھا۔ ہاں شدید جاڑوں میں شیروانی پر ایک اوور کوٹ کا مزید بوجھ ان کے سبک شانوں پر بڑھ جاتا تھا۔ چھڑی ہمیشہ ساتھ رہتی اور جوتا بھی ہمیشہ سلیم شاہی پہنتے تھے۔ آہستہ روی ان کی بے باکی اور اطمینان کی غماز تھی۔ اکثر شہر میں آتے جاتے سواری ہی پر ملتے تھے۔

یہاں تک تو نشور صاحب کے شخصی تعارف کے بارے میں میں نے عرض کر دیا۔ آگے آتی ہے ان کے معیارِ فن اور کمالِ سخن کی بات، تو اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ اردو شعروادب کے معتبر اور مستند اہلِ قلم موصوف کے لئے اپنی رائیں دے چکے ہیں اور ان کی شاعری کو کئی پہلوؤں سے پرکھ بھی لیا ہے، تاہم گفت گو تو جاری رہتا ہے اور ایسا بھی نہیں کہ کوئی رائے کسی خاص خیال پر منتج ہو گئی ہو، کوئی نہ کوئی گوشہ تشنہ رہ ہی جاتا ہے جس پر

کسی اور کی نگاہ پڑنی باقی ہو۔ علیٰ ہذالقیاس، میں اپنے محسوسات و خیالات چند سطروں میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جس میں غزل بطورِ خاص موضوع گفت گو ہے۔

نشور صاحب کی ابتدائی شعری تخلیقات سے ہی اس تنوع کی نشان دہی ہوتی ہے، جسے اختراع یا جدت طرازی کہتے ہیں۔ اور جیسے جیسے آگے بڑھتے یہ نیاپن ساون کی گھٹاؤں کی طرح پھیلتا، چھاتا ہوا نظر آتا ہے اپنے ابتدائی لغوی روایتی معنوں سے الگ ہٹ کر خالص ادبی دائرے میں انھوں نے غزل کو اس کی وسعتوں اور پہنائیوں سے روشناس کرایا، اور انداز، لہجے اور اسلوب کے نئے پن سے غزل کی معنوی خوبیوں کے کینوس کو گنجائشیں دیں، گفتگو یا اظہار کو، ایسے گوشے اور شوشے دیئے جو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ غزل کی زبان کا یہ موڑ، اپنے قدیم، خوبصورت، سجی ہوئی اور روایتی ڈگر سے کہیں زیادہ دل فریب و پرکشش ہے۔ غزل میں اندازِ بیان کے علاوہ انھوں نے جن تراکیب و الفاظ سے شعوری طور پر کام لئے وہ بیک وقت چونکا دینے والے بھی ہیں اور نکہت و نغمہ کی کیفیت بھی پیدا کرتے ہیں، دلپسند و اثر آفریں بھی ہیں اور فردوسِ سماعت بھی۔

سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس طور بھی اعجازِ نشور کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان اختراعات و اجتہادات کے باوجود انھوں نے اردو شاعری کی روایتی اور قدیم قدروں کی پاسداری بھی کی، کوئی حرف گیر مشکل ہی سے ملے گا جو یہ کہہ سکے کہ اپنی شاعری اور اظہارِ بیان میں وہ ماسبق بنیادی روایتوں سے رشتہ توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں یا احترام شاعری میں کسی مقام پر ان سے سوءِ ادب سرزد ہوا ہے، ایسا بھی ہے کہ ان کے کلام میں کہیں کہیں غرابت، الفاظ و تراکیب کی اجنبیت اور اسلوب یا بیان میں انجانی بے تحاشگی کے ساتھ نامانوسیت بھی مل جاتی ہے لیکن اگر غور کریں اور مکرر مکرر انہیں دیکھیں تو مذکورہ بادی النظر میں محسوس ہونے والا یہ کھٹکا ان محاسنِ شعری میں بڑی سرعت سے تبدیل ہوتا دکھائی دینے لگتا ہے اور ایک عجیب قسم کا نیا مزہ آنے

لگتا ہے۔

ہر فن میں تلوّن کا رُجحان فطری طور پر ہوتا ہے، اور تجربات ہوتے رہتے ہیں، ہوتے رہیں گے، اور ہونا بھی چاہیئے، یہ فن کار کا حق ہے، جہاں تک اُردو شعر و ادب کا تعلق ہے غزل بطورِ خاص تجربوں سے دو چار رہی، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور جاری رہے گا۔ شاعروں کو اس میدان میں کھلی آزادی بھی ہے بشرطیکہ نئی راہوں کی تلاش میں بے راہ رو نہ ہونے کی صلاحیت اُن میں شعوری اور ناگزیر حیثیت سے موجود ہو۔ نشورؔ صاحب کی شاعری بھی تجربے سے مُستثنیٰ نہیں، اور یہ تجربات انھوں نے بھی غزل ہی میں زیادہ کئے جس میں گنجائشیں تھیں، انھوں نے دوسرے اصنافِ سخن مثلاً نظم، مثنوی، قطعات اور رُباعیات حتیٰ کہ چند آزاد نظمیں بھی کہیں اور تھوڑی دُور یا دیر تک ترقی پسند ادب کے ہمرکاب بھی ہوئے لیکن ان پر یہ عقدہ جلد ہی کھل گیا کہ جدید تجربات و اختراعات کے زیرِ اثر دیگر اصنافِ سخن کا ماحصل جو بھی ہو اُردو شاعری میں غزل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اردو شاعر اپنی شناخت غزل ہی کے ذریعہ بہ آسانی بنا سکتا ہے جو اپنی پیدائش ہی سے پسندیدۂ عام ہے، حالانکہ ایک صوفی صافی بزرگ خاندان نژاد اور عالمِ دین ہوتے ہوئے موصوف اگر چاہتے تو اپنی ابتدائی کاوشیں جو "صہبائے ہند" کی شکل میں باضابطہ موجود ہیں، یا پھر "فلسفۂ خودی" وغیرہ جیسی دیگر تصانیف کے سلسلوں سے اپنے مدارج کی سیڑھیاں تخلیق کر لیتے لیکن نشورؔ صاحب اکتساباً عالمِ دین اور طبعاً شاعر تھے اور بہر حال کسب پر طبع غالب ہوئی جیسے ہونا بھی چاہیئے تھا لہٰذا انھوں نے غزل کو علی الخصوص انتخاب کر کے اپنے اندر چھپی ہوئی وہ ساری شعری صفات کی نقاب کشائی کر ڈالی جو انہیں من جانبِ قدرت ودلیعت ہوئی تھیں، چونکہ ان کے فطری دستور میں علمیت اور شاعری دونوں ہی قسم کی

احساس تھیں۔ پہلی کو انھوں نے اپنی کوشش سے جمع کیا تھا اس میں مجبوریاں یا توجیہات جو بھی رہی ہوں جب کہ دوسری، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، فطری طور پر ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، لہٰذا ان دونوں کے اخراج و مصرف کے لئے لاشعوری طور پر پہلی کو اوّلیت ملی اور نشور صاحب نے مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ اور تعلیقی نظمیں وغیرہ کہہ ڈالیں، باقی جو بچا کھچا انھوں نے فلسفۂ خودی اور اس سلسلے کی دوسری تصنیفات کے ذریعہ اس خزانے کو خالی کیا اور یہ کام اُنھوں نے بہت بعد میں کیا جب کہ ان کے طبع زاد شعری مجموعے خاصی تعداد میں آ چکے تھے، ایک اور بات اسی ضمن میں سُنتے چلئے کہ نشور صاحب کے ذہن پر نقشِ اوّل عالمانہ تھا اور وہ سطح پر تھا جس کی نکاسی "دانشِ آخر الزماں" کی صورت میں انہیں کرنی تھی اور یہ نکاسی انھوں نے "سلسلۂ فکرِ مشرق" کی ایک کڑی کی صورت میں کر دی جس میں بطورِ مصنف، ان کا نام نشور واحدی نہیں "مولانا نشور واحدی" لکھا ہے، اس کے بعد وہ اب نہ تو خالص مولانا رہ گئے نہ فلسفی اور نہ صوفی، بلکہ منجملہ جمیع اوصاف نمایاں اور امتیازی حیثیت سے وہ صرف شاعر بن کر اُبھرے اور وہ بھی بالخصوص غزل کے شاعر، جسے وہ غالباً چاہتے بھی ہوں گے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ نشور صاحب، خدا نہ کردہ عالم، فلسفی یا صوفی نہیں رہ گئے، ان منصوبوں کے نمغے تو انہیں پہلے ہی مل چکے تھے جو ان کے شخصی لبادے سے تاحیات چسپاں رہے لیکن ان کی حیثیت ضمنی ہو گئی، ان کا منصب اعلیٰ و آخر شاعر اور خصوصاً غزل گو شاعر ہو گیا۔

نشور صاحب نے غزل میں جو تجربات بے باکانہ، دلیرانہ اور اعتمادانہ کئے، ان کا انہیں احساس بھی تھا اور حق بھی اور یہ انہیں کا نہیں، ہر شاعر کا حق ہے، شرط یہ کہ وہ شئے لطیف

سے متصف ہو اور مناسب، جائز، نیز قابلِ قبول ایجادات واختراعات سے شعوری طور پر کلیتاً وَاقف ہو، سَاتھ ہی اس میں مخالفتیں اور رُکاوٹیں، صَبر کے سَاتھ برداشت کرنے کی پوری طاقت بھی ہو۔ اور سب سے پہلی بَات یہ، جسے میں آخر میں کہہ رَہا ہوں کہ جدّت طرازی اور تنوّع پسندی کی ہمت رکھتا ہو، جو میرے خیال میں سب سے بڑی اور سب سے اہم ہے، اور جو بڑے دِل گُردے وَالوں کے بس کا کام ہے۔

میں باشعور تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نشور صَاحب اس سلسلے میں بیشتر الزامی کے شکار ہوئے۔ اُن کے پھینکے ہوئے اکثر پانسے لوگوں کو اُلٹے ہی نظر آتے تھے۔ اعتراضات کی آوازیں شدید تر ہوتی گئیں، ان کے معاصرین میں شاذ ہی ان کی اختراعات سے اتفاق رکھتے تھے، کہیں نہ کہیں انگشت نمائی ضرور ہوتی گئی، کوئی "شبنمِ حیات" پر معترض ہوا تو کسی نے "فلک چن لے" پر ناک بھوں چڑھائی، کسی نے "دامن کہیں جلتا ہے" کی وضاحت چاہی تو کوئی "ٹیکتا چلا گیا" پر اٹکا اور کوئی "گلبانگِ پپیہا" کی ترکیب پر چونکا۔ ایسے موضوع اکثر زیرِ بحث آئے جو نشور صَاحب تک بھی ضرور پہونچے ہوں گے۔ لیکن اس موقعہ پر مجھے ایک غیر ادبی مگر بے حد مُناسب کہاوت یَاد آتی ہے جسے میں پردے جلوے میں عرض کردوں، کہ نشور صَاحب نہایت مستقل مزاجی اور جراَت کے سَاتھ اپنی ایجاد و منتخب کردہ راہ پر گامزن رہے اور معترضین چیخ پکار کرتے رَہے، بہر حال یہ سلسلہ جلد ہی ایک ایسے نقطے پر منتج ہُوا جہاں وہ تمام لوگ مداحین و معترفین کی صُورت میں صف بستہ نظر آنے لگے اور اس اعجاز نما انقلاب میں صِرف اور صِرف نشور صَاحب کی خود اعتمادی اور ہمتِ بے باکانہ کی کارفرمائی مجھے محسوس

ہوتی ہے جسے بنیاد بنا کر انھوں نے اپنے ایوانِ سخن کی بنا رکھی اور اسے تکمیل کے مرحلے تک اتنی تزئین کاری بخش دی، جو زیارت گاہ شعر و فن بھی ہے اور قابلِ تقلیدِ سخنورانِ مستقبل بھی تاکہ وہ اپنی مزید کاوشوں سے اس میں نئے پہلو اور گوشے تلاش کرتے رہیں جو ان کی اپنی ایجادیں کہلائیں گی۔ یہ دونوں ہی بڑے کام ہوئے۔

مختصراً یہ کہ نشور صاحب کے فنِ شعر گوئی اور فکرِ سخن کے تنوع نے نئے شاعروں کو ایک طرف تو نئی فکر و طرزِ ادا کی دعوت دی تو دوسری جانب اپنی شاعری کی پختگی و تازہ کاری سے اپنے معیارِ فن کی شناخت کرائی اور وہ بھی ایک ایسے دور میں جب تجربات کی بھرمار اور تنقید و اعتراضات کی یلغار ہر طرف سے ہو رہی تھی، ایسے میں اپنی مخصوص و ممتاز پہچان بنا لینا بہت بڑی کامیابی ہے

یہاں ایک بات اور ذہن میں ابھر رہی ہے، چاہتا ہوں عرض کر دوں۔ ایک واقعہ جسے پروفیسر نواب حسین کرائسٹ چرچ کالج کانپور نے لکھا ہے اور اسے نشور صاحب کے کسی مجموعۂ کلام میں آپ پڑھ بھی لیں گے کہ ۱۹۳۹ء میں جب نشور صاحب نوخیز و نومشق تھے اور جگر صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ کالج ھذا کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں سامعین کی فرمائشوں پر جگر صاحب نے تین چار غزلیں پڑھ ڈالیں۔ اب مصیبت یہ ہوئی کہ کونسا شاعر بلایا جائے جو جگر صاحب کے اس رنگ سے ہم آہنگ ہو۔ کوئی شاعر آمادہ نہ تھا تو ناظمِ مشاعرہ نے مجبوری نشور صاحب کو قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جیسا کہ پروفیسر صاحب کی روایت ہے اور بہتوں سے اس کی تصدیق بھی ہوئی کہ نشور صاحب کے مطلع شروع کرنے سے لے کر اختتامِ غزل تک ایک جانب تو مجمع کی داد و ستائش سے مشاعرہ لٹ رہا تھا تو دوسری طرف کیف و سرور کے عالم میں جگر صاحب پر وجد طاری تھا۔ اس واقعے سے کچھ لوگوں کا

یہ خیال ہو گا کہ ایسے حالات ہی شاید نشور صاحب کی پسندیدگی و شہرت کا سبب ہوئے، مجھے اس سے جزوی اختلاف نہیں لیکن کلیتاً اس سے اتفاق بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر نشور صاحب اس قسم کے مشاعروں میں شرکت نہ بھی کرتے یا پھر ان کی غزلیں بحیثیت مجموعی مشاعروں میں خاطر خواہ پذیرائی نہ کر پاتیں تو بھی کلیات کے تناظر میں ان کی اتنی ہی شہرت و عزت ہوتی جس مقام پر وہ آج ہیں، زود نہ سہی بدیر سہی۔ شاید اس سے آپ بھی اتفاق کریں۔

نشور صاحب نے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی اور کامیاب ہوئے یہاں تک کہ ان کی شمولیت مشاعروں کی اہمیت و کامیابی کی ضمانت سمجھی جانے لگی لیکن غیر مشاعرہ کی دنیا میں وہ اتنا ہی ممتاز مقام رکھتے ہیں جتنا انہیں مشاعروں میں حاصل رہا جس کی ایک تصدیق پاکستان میں "بزمِ نشور" کے قیام سے بھی ہوتی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شاعری کی ابتدا، اور موصوف کی شناخت مشاعروں ہی سے ہوئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بعد کی بات ہے۔

میں نے شاعروں کو خاص طور پر دو کیٹیگری میں بانٹ رکھا ہے ایک وہ جو مشاعروں میں پڑھتے اور خوب داد لوٹتے ہیں اور دوسرے وہ جو چھپتے زیادہ ہیں اور مشاعروں میں کبھی کبھار نظر بھی آجاتے ہیں، لہٰذا پہلے نمبر کے شاعروں کو میں "پڑھا" شاعر اور دوسرے نمبر کے شاعروں کو "لکھا" شاعر کہتا ہوں۔ بہت کم شاعر ایسے مجھے نظر آئے جو "پڑھے لکھے" دونوں ہی ہوں۔ پھر اوّل الذکر شاعر پڑھنے سے پہلے بزبانِ خاموشی اعلان کر دیتا ہے کہ "مزہ نہ آئے تو پیسے واپس"۔ جب کہ آخر الذکر کا یہ دعویٰ نظر آتا ہے کہ "بوجھو تو جانیں"۔ تو میں عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ نشور صاحب بفضلہ "پڑھے لکھے" شاعر تھے جسے آپ بھی جانتے ہیں لیکن ہاں ہمہ خوبی کی بات یہ کہ انھوں نے مذکورہ

دونوں اصلاحوں میں سے کسی ایک کو بھی کبھی نہیں اپنایا۔

آخری چند سطریں میں غالب کے ایک واقعے کے حوالے سے ختم کرنا چاہتا ہوں جس میں کسی کے استفسار پر مرزا صاحب نے فرمایا تھا "میں آموں کی قسم نہیں جانتا، بس اتنا جانتا ہوں کہ آم میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں"۔ آپ غور فرمائیں، غالب کی اس معصوم کلامی میں ان کی صلاحیتوں کی عظمتیں نظر آتی ہیں، میں نے شاید لڑکپن میں اسے پڑھا تھا اور شعور کی دُنیا تک پہونچتے پہونچتے کسی حسین شعر کے ایک مصرعہ کی طرح میرے ذہن میں محفوظ تھا، دوسرے کی تلاش تھی۔ آخر خدا نے میری آرزو پوری کر دی، اور مجھے دوسرا مصرعہ اتنا ہی درست و چست مل ہی گیا اور یہ مصرعہ بیگم نشور واحدی (محترمہ مومنہ واحدی) کی زبانی دستیاب ہوا۔ ہُوا یہ کہ انھوں نے کسی ریڈیو یا ٹی وی کے لئے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا۔

ان سے رُخسانہ مظہر نے سوال کیا تھا:

"جب آپ نشور صاحب کے ساتھ پہلی بار کان پور آئیں تو آپ کو کیسا محسوس ہُوا۔ آپ کو کچھ یاد ہے"؟

مومنہ واحدی صاحبہ نے جواب میں فرمایا:

"بہت اچھی طرح یاد ہے۔ جب پہلی بار کانپور آئی تو ٹِن کے ایک کنستر میں آٹا لایا گیا اور چاول دال وغیرہ بھی خرید کر آیا تب میں نے نشور صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ سب مجھے پکانا ہے!۔ انھوں نے کہا۔ ہاں ۔ تھوڑا تھوڑا کر کے پکانا ہے"۔

نشور صاحب کے اس جواب سے آپ فیصلہ فرمائیں، غالب کے مذکورہ پہلے مصرعہ سے نشور صاحب کا یہ مصرعہ مل کر ایک مکمل شعر نہیں بن جاتا؟!! ▲▲

شمیم عثمانی

حرفِ آخر ۹ فروری سنہ ۱۹۹۹ء

۹۲/۳۷ ہیرامن اسٹریٹ۔ کان پور

انیس چشتی (صحافی)
انگریزی سے ترجمہ: محمد امیر شرر

نشور واحدی
(ایک تجزیہ)

حالانکہ نشور واحدی نے بیسویں صدی کے ہندوستان میں آنکھیں کھولیں لیکن مشرق اور مشرقِ وسطیٰ کی گزشتہ سیکڑوں سال کی روحانی، ادبی اور لسانی روایات، ان کے دل و دماغ اور شخصیت میں رچی بسی تھیں۔ انھوں نے عربی فارسی اور اُردو کی مذہبی اور ادبی وراثت کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، خود ان کا اپنا ذہنی ارتقا کسی حد تک اُس غزل کی ارتقا سے مماثلت رکھتا ہے، جو اپنے ارتقائی سفر میں عرب سے فارس ہوتی ہوئی ہمارے ملک میں اس منزل تک پہنچی، جہاں آج ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں نشور کی غزلیات میں ایک ایسا شعری پیکر ملتا ہے، جسے انھوں نے اپنی تخلیقی ذہانت، اپنے احساسِ کرب اور شعری وجدانیت سے تراش کر بے انتہا حسین بنا دیا ہے ان کی شاعری جس رُومانیت کی آئینہ دار ہے اُسے فارسی اور اُردو کی بہترین روایات کے مدِمقابل رکھا جا سکتا ہے، ایسا ہی کچھ ان کی نثری تخلیقات سے بھی ظاہر ہوتا ہے، جو ان کے آخری ایامِ حیات میں سامنے آئیں۔

نشور کے یہاں ان تمام تخلیقی عناصر کا بیش بہا خزانہ ہے جس کو انھوں نے اپنے پیچیدہ روحانی و داخلی جذبات و احساسات اور علم و حکمت کا خوبصورتی کے ساتھ اظہار کرنے کے لئے انتہائی

ماہرانہ انداز میں، اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے، انھوں نے اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی انسانی زندگی کے غم و آلام، ذہنی اُلجھنوں اور کرب و اذیّت کا نہ صرف گہرا مشاہدہ کیا بلکہ ایک حسّاس انسان کی طرح اُسے دل سے محسوس کیا جو انہیں قنوطیت، افسردگی اور یہاں تک کہ تنفّر کے گرداب میں غرق کر دینے کے لئے کافی تھا لیکن انتہائی شاعرانہ مہارت کے ساتھ وہ ان امواجِ بیکراں سے گزر گئے۔ انھوں نے اپنے اندازِ فکر کے اظہار کا بے نظیر شاعرانہ انداز اپنایا۔ اگر ان کا قلم کسی موقع پر جھجھکا بھی (جب کہ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو) یا اپنے خیالات کے اظہار کے دوران انھوں نے کسی مُروّجہ تشبیہہ اور استعارے (جو ان کی شاعری کا حُسن ہیں) سے کنارہ کشی بھی اختیار کی تو انھوں نے اس کی جگہ، اپنے اچھوتے اندازِ بیان سے ان کی کمی کو اس طرح پُورا کر دیا کہ شعر پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گیا، یا پھر خود ساختہ تشبیہہ و استعارات سے اسے مُزیّن کیا، جس سے شعر میں ایک نیا اندازِ تغزّل پیدا ہو گیا۔ ان کے انہیں شاعرانہ اختراعات نے انہیں اپنے ناظرین اور سامعین میں بے انتہا مقبول بنا دیا۔ موسیقی کے تاروں پر رقصاں، ان کی شاعری کے لطیف محاسن، ایک سحر انگیز ارتعاش پیدا کرتے ہیں جس کی غنائیت سامعین کو سحر زدہ کر دیتے ہیں، ان کی شاعری کی نغمگی نے ہمیشہ اپنے ہمعصروں میں انہیں ممتاز کیا ہے اور ان کی آواز نے مشاعروں اور نشستوں کو ایک ایسا ترنم عطا کیا ہے جو آج بھی کانوں میں رس گھول رہا ہے۔

نشورؔ واحدی ہمیشہ اپنے فکر و فن کو (چند نظموں کو چھوڑ کر جیسے "میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں") قنوطیت کی آلودگی سے پاک رکھنے میں کامیاب رہے ہیں، کیونکہ خود ان کی اپنی زندگی پارسائی کی حد تک رُوحانی اور رُوحانی طور پر قانع و مطمئن رہی ہے جب کہ اس کے برعکس بہت سے فن کاروں کے لئے اس مادّی دُنیا کی دل کشی سے دامن بچانا ممکن نہ ہو سکا۔

نشورؔ نے حالانکہ عہدِ رفتہ کی تاریخی، ثقافتی اور سماجی حالات و تجربات سے استفادہ

کیا ہے لیکن، ان کے یہاں ایسی بصیرت ہے جو خود اعتمادی کے ساتھ مستقبل میں جھانکتی ہے، اس طرح وہ صحیح معنوں میں اپنے عہد کے ترجمان تھے، اکثر وہ ذہن و فکر کے نہاں خانوں میں مخفی وجودیت کی امواج میں ڈوبتے اُبھرتے نظر آتے ہیں، اور غالب کی طرح ان مسائل پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں، جیسے دورِ حاضر کے مشرقی فلسفے کی پیش گوئی کر رہے ہوں۔ اسی طرح وہ بہت سے ایسے جدید خیالات اور تجربات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں، جو ان کے ہم عصروں کے کلام میں موجود نہیں ہیں۔

سامعین سے دادِ تحسین کے حصول کے لئے انھوں نے کبھی عامیانہ شعر نہیں کہے۔ اس کے برعکس انھوں نے شاعری کا وہ معیار برقرار رکھا جو اہلِ علم و ادب اور مشاعروں کے سامعین دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے اور تحسین و آفرین حاصل کرتا ہے۔ یہ تصوّر کرنا بھی مشکل ہے کہ ٹیلی ویژن کے موجودہ دور میں اگر وہ بقیدِ حیات ہوتے تو عوام و خواص میں کس قدر مقبول ہوتے ان کی شاعری کی عظمت کا اندازہ لگانے اور حقیقی مرتبہ تک اُسے پہنچانے میں تنقید نگاروں کو شاید ابھی کچھ وقت لگے گا۔ یہ ایک خوش کن خبر ہے کہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں ان کی ادبی شخصیت اور شعری کارناموں پر ریسرچ جاری ہے۔ ▲▲

انیس چشتی

اے / بی ۴۴ ۱۱۴۴۔ بسنت گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۷

تاباں ہے نشور اپنا تخیل تو کروں کیا
پردہ مہ و انجم پہ گرائے تو بنے ہے

نشور واحدی

اُردو غزل

اُردو زبان کا سب سے قیمتی سرمایہ غزل ہی ہے اور غزل نے بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے، میرا یہ خیال ہے کہ اگرچہ اردو غزل، فارسی غزل کے نقشِ قدم پر ہے، پھر بھی وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے فارسی غزل سے زیادہ پیچیدہ، زیادہ فن کارانہ اور زیادہ لچک دار ہے۔

نشور واحدی

نوٹ : ایک شعری نشست میں نشور صاحب نے اپنی ایک مشہور غزل :

"رُخ بدلتے راہ چلتے گُل عذاروں کو نہ چھیڑ"

سُنانے سے پہلے اُردو غزل کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ چند کلمات کہے تھے جسے ٹیپ کرلیا گیا تھا۔

غزل ہے نام حسن کے معاملاتِ خام کا
خطا ہوئی کہ دلبروں کی بات کہتے آئے ہیں

نشور واحدی

اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک

غیر مطبوعہ
غزلیں

نشور واحدی

جدّت پہ آپ کی میں نہیں معترض نشورؔ
کچھ شاعری کا رنگ بدلنا ہے آپ کو

نشورؔ واحدی

معاشرہ

محورِ حُسن و نزاکت ہے سماج
زندگی ہے ایک شاعر کا مزاج
سنگ و آہن وقت کے خوش پوش لوگ
توڑ دیں انسانیت کا ہر زُجاج
رُوح کی پاکیزگی مذہب کی جان
دین اک سچی رواداری کا تاج
کارِ مفتی عالمی وحدت کی فکر
بین الاقوامی رَوِش پر احتجاج

کارِ سرمایہ مہذّب رہزنی
جنّتِ ارضی میں ہے اُن کا ہی راج
ہر مورّخ فطرتِ نفرت پسند
دفترِ پارینہ اُن کا اندراج
بہرِ شاعر نا روا اعزازِ وقت
بہرِ ناداں کرسی و دیہیم و تاج

شکوہ بر لب کیوں نظر آئے نشورؔ
چپ رہے یاں ہر شاعر نازک مزاج

۱۸ر دسمبر ۱۹۸۲ء

☆

لالہ و گُل کے تخیّل سے لہکتی جائے ہے
اِک ہوا ہے شاعری بھی جو سِنکتی جائے ہے

ہے مِرے اَنفاس سے یہ زندگی کا جزر و مدّ
دِل دَھڑکتا ہے تو دَھرتی بھی دھڑکتی جائے ہے

صبح کو ان کے خرامِ ناز کا عالم نہ پوچھ
شاخِ گُل ہے صحنِ گلشن میں لچکتی جائے ہے

اِک جھلک دیکھی تھی دامانِ خیالِ یار کی
دُور تک بجلی تصوّر میں چمکتی جائے ہے

میرے آنسو بن گئے اوراقِ ماضی کے نقوش
زندگی تاریخ کے پیچھے سرکتی جائے ہے

حدِ انسانیت سے دُور ہے ہر کارواں
راہبر کوئی نہیں دُنیا بھٹکتی جائے ہے

تیرے نالے بے اثر ان کا تبسّم دلخراش
ایک تھکی آواز اُردو کی وہ تھکتی جائے ہے

ان عوامی شاعروں کی داستانِ غم نشورؔ
اب تو آنکھوں سے لہو بن کر ٹپکتی جائے ہے

(یکم اپریل ۱۹۸۲ء آجکل دہلی)

نہ تو درد بڑھا نہ تو اشک چلے
کہیں شام ہوئی تو چراغ جلے

تری یادِ حسیں، مرے دل کے قریں
کہیں جیسے نسیمِ بہار چلے

کوئی جنگ ہے اپنی حقیقتِ غم
نہ تو موت ٹلے، نہ حیات ٹلے

ترا آئینہ خود ہی سیاہ نہ ہو
کہ زمانہ میں ہم ہیں برے نہ بھلے

سرِ بزم ضیا ہے سبھی کیلئے
اب اندھیرا نہیں ہے چراغ تلے

کوئی غم ہو لشوؔر تو آہ نہ کر
کوئی دِل نہ دُکھے کوئی دِل نہ جلے

(۲۵ فروری سنہ ۱۹۸۲ء)

ہر لمحہ آگہہ، ہر لمحہ حیراں
دِل کی حقیقت، آئینہ ساماں

ان کی نظر ہو یا طبعِ شاعر
یہ بھی غزل خواں، وہ بھی غزل خواں

پھلواریوں سے حرص و ہوس کی
گزرا ہُوں میں بھی برچیدہ داماں

رمزِ محبت، دل کش تبسم
کوئے سیاست گیسوئے پیچاں

بے اعتمادی کا ہے یہ عالم
دہشت زدہ ہے انساں سے انساں

یہ حسنِ رنگیں، یہ عشقِ غمگیں
دونوں حقیقت دونوں رگِ جاں

شعرِ نشور اور سونی یہ محفل
آئی کہاں سے شامِ غریباں

۲۴ مارچ ۱۹۸۱ء

کہتا ہے زمانے کا تیور، کچھ دُور رہو مہ پاروں سے
کیوں کھیلے کوئی انگاروں سے، کیوں پھول چنے رخساروں سے

خاموش نہیں ہے کوئی خبر، بجتی ہے نسیمِ شام و سحر
ہے کچھ تو حریمِ جاناں میں، اندازہ ہُوا جھنکاروں سے

شیشہ ہو کہ ساغر اے ہمدم ناواقفِ دردِ سنگِ الم
ٹوٹا ہُوا دل ملتا ہی نہیں، میں لوٹ چلا بازاروں سے

ویران بھی ہے رنگین بھی ہے، دنیا بھی عجب اک رستہ ہے
یاں چوٹ لگی ہے پھولوں سے، یاں زخم بھرے ہیں خاروں سے

اُردو کی کہانی بھی دلکش، بے باک سی ہے کچھ یہ مہوش
اس طرح چلی درباروں سے ٹکرا ہی گئی سرکاروں سے

ہے شعرِ نشورؔ اک سازِ الم، رنگیں رنگیں اک نغمۂ غم
کیوں شبنمِ گُل میں ڈوب گیا ٹپکا تھا لہو جو تاروں سے

(۲۰ فروری ۱۹۸۱ء، لکھنؤ ریڈیو کیلئے)

معطّر اتنی ہے کس کے اثر سے پوچھ تو لو
کہاں سے آتی ہے بادِ سحر سے پوچھ تو لو

نہ دھوپ ہے نہ کہیں چھاؤں ہے چراغ تلے
فریبِ نو ہے شمس و قمر سے پوچھ تو لو

یہاں نہیں کوئی تقسیم دل کی دنیا میں
حیات کیا ہے یہ روحِ بشر سے پوچھ تو لو

نہ کوئی دور ہے ماضی نہ کوئی مستقبل!
زمانہ ایک ہے شام و سحر سے پوچھ تو لو

ہے بیچ راہ میں انسانیت بھٹکتی ہوئی
قدم کہاں ہے کسی ہمسفر سے پوچھ تو لو

حسین نظم میں بھی شعریت نہیں ہے نشورؔ
یہ فنِ شعر ہے اہلِ نظر سے پوچھ تو لو

مشاعرہ قومی یکجہتی مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۸۰ء لکھنؤ

کی عطا ماضی نے وہ آئینہ سامانی مجھے
ہر جگہ بکھری ملی تصویرِ انسانی مجھے

ساقیا پھر ایک جامِ نو بہ صہبائے کہن
پھر بدلنا ہے خمیرِ عالمِ فانی مجھے

نالہ نغمہ ہو گیا میری زباں کے فیض سے
حسنِ فطرت نے عطا کی وہ گل افشانی مجھے

کون پوچھے کارسازِ پردۂ اسرار سے
شوق باقی ہے تو کیوں دی زندگی فانی مجھے

اس سفر میں ہر مسافر کی ہے منزل بھی الگ
مَیں جہاں ٹھہرا ملی ہے سطحِ انسانی مجھے

اک تبسّم ہے کلی کا، اپنی ہستی کا شعور
زندگی ہے ایک درسِ تنگ دامانی مجھے

اک نگاہِ شوق سے روشن ہوا اسرارِ زیست
جیسے سب معلوم تھا رازِ جہاں بانی مجھے

خود بخود کھلنے لگے دانائی لو کے فریب
جلد ہی ہونے لگا احساسِ نادانی مجھے

فکر میں وسعت ہو اور گہرا ہو کچھ رنگِ غزل
جانتے ہیں سب نشورؔ اس طرز کا بانی مجھے

(۵ فروری ۱۹۸۰ء ریڈیو لکھنو برائے گورکھپور)

دلِ فگاروں پہ ستم ہو یہ چلن آج بھی ہے
دُور تک سلسلۂ دار و رسن آج بھی ہے

اَب بھی بے نُور ہیں ایوانِ محبّت کے چراغ
رنگ در رنگ جراحت کا چمن آج بھی ہے

انہیں ذرّوں سے دھڑکتے ہوئے دل اُٹھیں گے
ہلکی ہلکی یہ اُمیدوں کی کرن آج بھی ہے

چونکتے سب ہیں مگر چونک کے سو جاتے ہیں
محفلِ کہنہ میں کچھ تازہ سخن آج بھی ہے

ایک لغزش کی کئی بار سزا اہل کے رہی
سود در سود زمانے کا چلن آج بھی ہے

کس نے پہچانا ہے، اے دوست زمانے کا مزاج
وقت کے ماتھے پہ تھوڑی سی شکن آج بھی ہے

آدمی وہ نہیں، اب شہر کی گلیوں میں نشور
منظرِ صبحِ وطن شامِ وطن آج بھی ہے

۵؍ اکتوبر ۱۹۷۹ء۔ نیا دور لکھنؤ

کوئی جلوہ ہو کوئی شعلہ ہو کوئی بات ہو تو بتائیے
ابھی شام اوّلِ شام ہے ذری رات ہو تو بتائیے

کوئی دھوم دھام یہاں نہیں غمِ درد عام یہاں نہیں
کسی شہرِ علم و کمال میں یہ برات ہو تو بتائیے

یہ مِفالِ میکدہ چھوڑ دوں یہ پیالہ پھینک کے توڑ دوں
مگر ان کی نیچی نگاہ میں یہ حیات ہو تو بتائیے

وہی کامیابِ جنوں رہا، جو دلِ شکستہ میں جا بسا
جو دل اپنا ہار گیا کہیں، اُسے مات ہو تو بتائیے

یہ مسیحِ وقت جو آئے یاں، وہ مرض بڑھا گئے بیکراں
یہ طویل وعدہ نجات کا، جو نجات ہو تو بتائیے

جو سماج آج ہے کل نہ تھا، جو مزاج کل تھا وہ اب نہیں
کسی اک نظامِ حیات کو جو ثبات ہو تو بتائیے

وہ دلوں کے گوشے نہیں رہے جہاں تھی نشور کی اک جگہ
کسی اور شہر نکل چلیں، ابھی رات ہو تو بتائیے

ٹی وی مشاعرہ لکھنؤ۔ ۲۹ جون ۱۹۷۹ء

چونکتے سب ہیں مگر چونک کے سو جاتے ہیں
محفلِ کہنہ میں کچھ تازہ سخن آج بھی ہے

ایک لغزش کی کئی بار سزا اہل کے رہی
سود در سود زمانے کا چلن آج بھی ہے

کس نے پہچانا ہے، اے دوست زمانے کا مزاج
وقت کے ماتھے پہ تھوڑی سی شکن آج بھی ہے

آدمی وہ نہیں اب شہر کی گلیوں میں نشورؔ
منظرِ صبحِ وطن شامِ وطن آج بھی ہے

۵ر اکتوبر ۱۹۷۹ء ۔ نیا دور لکھنؤ)

کوئی جلوہ ہو کوئی شعلہ ہو کوئی بات ہو تو بتائیے
ابھی شام اوّلِ شام ہے ذری رات ہو تو بتائیے

کوئی دھوم دھام یہاں نہیں غمِ درد عام یہاں نہیں
کسی شہرِ علم و کمال میں یہ برات ہو تو بتائیے

یہ سفالِ میکدہ چھوڑ دوں یہ پیالہ پھینک کے توڑ دوں
مگر ان کی نیچی نگاہ میں یہ حیات ہو تو بتائیے

وہی کامیابِ جنوں رہا، جو دلِ شکستہ میں جا بسا
جو دل اپنا ہار گیا کہیں، اُسے مات ہو تو بتائیے

یہ مسیحِ وقت جو آئے یاں، وہ مرض بڑھا گئے بیکراں
یہ طویل وعدہ نجات کا، جو نجات ہو تو بتائیے

جو سماج آج ہے کل نہ تھا، جو مزاج کل تھا وہ اب نہیں
کسی اک نظامِ حیات کو جو ثبات ہو تو بتائیے

وہ دلوں کے گوشے نہیں رہے جہاں تھی نشورؔ کی اک جگہ
کسی اور شہر نکل چلیں، ابھی رات ہو تو بتائیے

ٹی وی مشاعرہ لکھنؤ۔ ۲۹ جون ۱۹۷۹ء

اِس طرح غم کا اِکرام مشکل
ہر صبح مشکل، ہر شام مشکل

اوّل قدم سے آخر قدم تک
راہِ طلب کا اِتمام مشکل

بے لذّتِ غم بے جہدِ پیہم
آرام میں بھی آرام مشکل

مرنا بھی آساں، جینا بھی آساں
ہمّت نہ ہو تو ہر کام مشکل

یہ خارِ صحرا، ہم پا برہنہ
ہر گام رنگیں، ہر گام مشکل

پھولوں کو مجرم کہنا ہے آساں
موجِ صبا پر الزام مشکل

ہر بات الوکھی، ہر بات ادھوری
طرزِ سخن کا اتمام مشکل

برائے ٹی وی، لکھنؤ ۸ جون ۷۹ء

یہ فضائے نالۂ غم یہ فغانِ ناتوانی
سبھی سن رہے ہیں اے دل نئے دور کی کہانی

کوئی سانس لے تو کیسے کہ فضا ہی دل شکن ہے
نہ وہ شام ہی منوّر، نہ وہ رات ہی سہانی

کہیں برقِ آہِ سوزاں، کہیں اشکِ چشمِ باراں
کہیں ٹھیر جا مسافر کہ برس رہا ہے پانی

سفرِ حیات مبہم، ہے عبورِ سنگ و آہن
کہ قدم قدم تھکاوٹ کہ نفس نفس گرانی

کہیں اک نفس کی قیمت ہے ہزار زخمِ کاری
کہیں مفت بٹ رہی ہے یہ متاعِ زندگانی

وہیں دور ہو سکے گی غم و درد کی گرانی
کسی میکدہ میں چلئے جو بچی ہو عمرِ فانی

یہ ہجومِ لفظ و معنیٰ ہے نشور اک اشارہ
جسے کہیے فکرِ شاعر ہے زبانِ بے زبانی

برائے ٹی وی لکھنؤ - ۲۴ اپریل ۱۹۷۹ء

وَفا ہو یا جفا ہو حسرتِ بالیدہ ہے وہ بھی
محبّت جس کو کہتے ہیں گُلِ ناچیدہ ہے وہ بھی

حسینٗ تر جو صلے رکھتا ہے اک محبوب کا پیکر
ادائے بے نیازی ہے مگر غم دیدہ ہے وہ بھی

کِسی کو نیندٗ آ سکتی ہے کیا بزمِ تہتک میں
جسے کہیے زمانہ دردِ ناخوابیدہ ہے وہ بھی

نظر بھیرے ہوئے ملتا ہے رستے کا ہر اک ساتھی
جسے ہم دوست سمجھے تھے نظر دُزدیدہ ہے وہ بھی

خود اپنے فیصلے پلٹے ملیں گے اپنے ہاتھوں میں
سیاست جس کو کہتے ہیں بخود پیچیدہ ہے وہ بھی

غزل میں مائلِ فریاد ہے جیسے کوئی نغمہ
نشورؔ اس کو کہے ہیں شاعرِ غم دیدہ ہے وہ بھی

۴، جولائی ۱۹۷۷ء

ؔله ماہنامہ نیا دَور لکھنؤ میں یہ مصرع یوں شائع ہُوا تھا۔ شکستِ دلبری ہے شاید اک محبوب کا پیکر
ٹه ماہنامہ نیا دَور لکھنؤ میں یہ مصرع یوں شائع ہوا تھا۔ کسی کو نیند آ سکتی ہے اس بزمِ تہتک میں۔

ہر اِک چہرے سے بے رُبطی عیاں ہے
محبّت ہے مگر جانے کہاں ہے

ترے کانوں میں آتے ہیں جو الفاظ
وہ بے معنی سی کوئی داستاں ہے

یہ ہستی ہے مُسلسل خواب لیکن
ہر اِک لمحہ حیاتِ جاوداں ہے

کوئی شیدا نہیں حُسنِ بُتاں کا
بظاہر اِک ہجومِ عاشقاں ہے

ہمیں تم ہیں رموزِ بزمِ ہستی
زمانہ ایک اندازِ بیاں ہے

نشورؔ اپنی غزل سے روشنی لے
کہ شاعر بھی چراغِ گُل فشاں ہے

مستقبلِ عالم کی اِنساں کو خبر کیا ہے
آئینے کا پرتو ہے کیا جانے اُدھر کیا ہے

دانش کے سبھی رستے ویران ہیں صدیوں سے
جس پر نہ چلے کوئی وہ راہ گزر کیا ہے

منزل بھی گریزاں ہے رستے بھی سفر میں ہیں
دھوکا ہے سفر کا یہ احساسِ سفر کیا ہے

دانائی کے پردے میں روپوش ہے نادانی
ہم کو ہے خبر لیکن ہم کو بھی خبر کیا ہے

اِک خواب محبت میں سو خواب ہیں قسمت کے
ہے رات کا اِک حصہ شاعر کی سحر کیا ہے

۲۹ دسمبر ۱۹۷۸ء

ساقی کی بیگانہ روش پر کیا الزام لگایا جائے
ہستی اک ایسا پیمانہ بھرتے جاؤ چھلکتا جائے

دُنیا میں اسرارِ گنہ بھی ایک ادائے مجبوری
توبہ[1] توبہ ہوتی جائے اور دامن بھیگا جائے

[1] پہلے مصرع اس طرح تھا: جیسے دامن بھیگا جائے جیسے آنسو ٹپکا جائے۔

کتنے بادل بجھ گئے اور کتنی برکھا سوکھ گئی
دُنیا ہے وہ ریت کا رستہ ساون بھادوں پیاسا جائے

آنسو نے کچھ کام کیا اب بارِ الم بھی ہلکا ہے
غم کا لمحہ بھی اک بادل کھلتا جائے برستا جائے

حسرت و غم ہو، آرزوئیں ہوں کوئی محوِ خواب نہیں
دل سینے میں وہ انگارہ بجھتا جائے دہکتا جائے

عشق ربودہ کی وہی صورت جیسے نشہ میں نیند ملے
حسنِ غنودہ کا وہی عالم جیسے مہوا ٹپکا جائے

مرگ بھی تنہا زیست بھی تنہا، راہ کا ساتھی کوئی نہیں
راہ کٹیلی رات اکیلی، عشق ہی سوتا جگتا جائے

آؤ نشورؔ سے پوچھیں چل کر کیسی ہے یہ گرم ہوا
پتھر پتھر لوٹ رہا ہے شیشہ شیشہ سہما جائے

۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء ریڈیو لکھنؤ

ہر قرار و ثبات گزرے ہے
تیز قدموں حیات گزرے ہے

ہر گلی سے ہوائے زُلفِ بُتاں
باہمہ عطریات گزرے ہے

کیوں کریں کوئی بدشگونی ہم
زندگی کی برات گزرے ہے

ہر سماج اپنے ذوق کے ساتھ
ماورائے جہات گزرے ہے

یوں گزرتی ہے زندگی اپنی
جیسے رونے میں رات گزرے ہے

(۲۱ مارچ ۱۹۷۷ء)

لبوں پہ گردِ ترنم کبھی جمی بھی نہیں
مرے سخن میں کسی بات کی کمی بھی نہیں

فلک کو چھوڑ کے اب آ رہا زمیں پہ غُبار
اُٹھی جو گردِ الم آج تک تھمی بھی نہیں

کچھ اور مانگ خدا سے کہ زندگی ہے وبال
حیات کی تری دنیا میں کچھ کمی بھی نہیں

غمِ جہاں کا غموں میں شمار ہی کب تھا
وہ غم بھی کیا جو بہ اندازِ بے غمی بھی نہیں

ہر ایک فرد ہے حیوان خوش لباس نشورؔ
ہم آدمی ہیں پہ دراصل آدمی بھی نہیں

۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء

انہیں دیکھ کر ہم کہاں تک سنبھلتے
ہمیں سو گئے کچھ دِیا جلتے جلتے

ہماری نگاہوں تلک آ گئے وہ
غزل کی طرح کتنے سانچوں میں ڈھلتے

کبھی قیدِ مغرب، کبھی قیدِ مشرق
جو آزاد ہوتے قفس کیوں بدلتے

ہواؤں کی رفتار ہے تیز اتنی
چمن بچ گیا ہے کچلتے کچلتے

سنہری سی زُلفوں کا بہتا سا سونا
تمہیں دیکھ لو بادلوں کو پگھلتے

قدم رکھتے ہی منزلوں نے پکارا
پہنچ ہی گئے ہم بھی گرتے سنبھلتے

نشورؔ آج ہم ہیں اندھیروں کے مہماں
جو شاعر نہ ہوتے تو کرنوں پہ چلتے

۱۱ جون ۱۹۷۳ء

پلکوں کے نرم سائے میں پلنا ہے آپ کو
اور زندگی کی دُھوپ میں چلنا ہے آپ کو

صہبا کہاں ملے گی، تعین نہیں کوئی
کچھ دُور خالی جام بھی چلنا ہے آپ کو

اندازِ التفات کے ساغر کو چوم کر
ساقی کا بھی مزاج بدلنا ہے آپ کو

تبدیلیوں کی آنچ میں تپ کر بہ فیضِ شوق
سانچے میں انقلاب کے ڈھلنا ہے آپ کو

ہے عاشقی کو مسلکِ پروانگی پہ فخر
جلتے ہوئے چراغ پہ جلنا ہے آپ کو

کرسی وزارتوں کی ہے چڑھتا ہوا نشہ
ایسے میں گرتے گرتے سنبھلنا ہے آپ کو

جدت پہ آپ کی ہیں نہیں معترض نشور
کچھ شاعری کا رنگ بدلنا ہے آپ کو

(۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء ۔ دہلی)

نامِ اُن کا زباں پر ابھی لائے نہ بنے ہے
افسانے کا عنواں بتائے نہ بنے ہے

اے شامِ الم تو ہی اُنہیں جا کے منا لا
رُوٹھے ہیں وہ ایسے کہ منائے نہ بنے ہے

بے گانگیٔ رابطِ محبّت کو نہ پوچھو
آئے جو بنے واں سے تو جائے نہ بنے ہے

جلدی سے کوئی پونچھ لے کس طرح سے آنسو
جلتے ہوئے دیپک کو بجھائے نہ بنے ہے

جب تک کوئی رنگین سی آواز نہ کھنکے
سوتی ہوئی راتوں کو جگائے نہ بنے ہے

کیا جانئے ان مست نگاہوں نے کیا کیا
ساغر بھی اٹھاؤ تو اٹھائے نہ بنے ہے

جاری ہے ترنّم کا مرے فیض بھی لیکن
اندازِ سخن میرا اڑائے نہ بنے ہے

تاباں ہے نشورؔ اپنا تخیّل تو کروں کیا
پردہ مہ و انجم پہ گرائے نہ بنے ہے

۱۸ فروری ۱۹۷۳ء

جابجا ظلمتوں کا ڈیرا ہے
بجھ گئی شمعِ غم اندھیرا ہے

عشق اک کاروانِ آگاہی
حسن اک بے خبر لٹیرا ہے

شہر کی خوش نصیب گلیوں میں
ہم سے بدقسمتوں کا پھیرا ہے

اک زمانہ ہوا ہے روٹھے ہوئے
اب بھی آجائیے سویرا ہے

ایک لمحہ کی روشنی ہے نشورؔ
وقت اک مستقل اندھیرا ہے

۲۳ نومبر (سنہ ۱۹۷۳ء)

لکھنؤ

یہ شہرِ باغ ہے حضرت محل کی یادوں کا

ہر ایک کوچے پہ کھِلتا ہُوا گلاب کوئی

نظر نواز ہے دِلّی کی چاندنی بھی مگر

اَودھ کی شام کا مِلتا نہیں جواب کوئی

حسین تصوّرِ ماضی نقوشِ مُستقبل

یہ لکھنؤ ہے کہ ہے گومتی کا خواب کوئی

۲۶ اگست ۷۲ء۔ لکھنؤ

نظر کو مئے ارغوانی کہیں گے
ان آنکھوں کو بھولی کہانی کہیں گے

محبّت کو بھی آنی جانی کہیں گے
جو روٹھے اُسی کو جوانی کہیں گے

تم آؤ تو پورا فسانہ سمجھ لیں
یہ شاعر ادھوری کہانی کہیں گے

ستاروں پہ بھی حکم چلتا رہے گا
محبّت کو راتوں کی رانی کہیں گے

ہر اِک جرعہ میں خود کو ہم پی رہے ہیں
ہر اِک جام کو عمرِ فانی کہیں گے

(۵ر مئی سنہ ۱۹۷۱ء برائے کلکتہ)

جو طوفاں کے مزے پائے ہوئے ہیں
وہ پھر ساحل سے ٹکرائے ہوئے ہیں

ہر اک تہذیب ہے ممنون میری
یہ گیسو میرے سلجھائے ہوئے ہیں

یقیں ہے جن کو الفاظِ حسیں پر
وہ دھوکا آج بھی کھائے ہوئے ہیں

جو طوفاں کے مزے پائے ہوئے ہیں
وہ پھر ساحل سے ٹکرائے ہوئے ہیں

ہر اک تہذیب ہے ممنون میری
یہ گیسو میرے سلجھائے ہوئے ہیں

یقیں ہے جن کو الفاظِ حسیں پر
وہ دھوکا آج بھی کھائے ہوئے ہیں

اندھیرے میں ہیں پروانے خرد کے
چراغوں کے تلے آئے ہوئے ہیں

بہاریں بجھ گئی ہیں اس چمن کی
یہ لمحے جیسے مرجھائے ہوئے ہیں

معطر سی ہیں گلشن کی فضائیں،
سنا ہے وہ یہاں آئے ہوئے ہیں

نثور اک دور ہے منکر تو کیا غم
دماغوں پر ہمیں چھائے ہوئے ہیں

۴ نومبر ۱۹۷۰ء
بہ حالتِ علالت

ہر نظر کو یہ تبسّم، یہ پیام آتے نہیں
کِھلتی کلیوں کو یہ اندازِ کلام آتے نہیں

انتظارِ دوست بھی ہے چلتی سانسوں کا شمار
صبح وہ آتے نہیں، اور وقتِ شام آتے نہیں

سُننے والوں نے سُنا ہے یہ لبِ منصور سے
دارسے پہلے محبت کے سلام آتے نہیں

زلف و رُخ کی یہ کہانی سُنتے سُنتے سو نہ جا
لَوٹ کر یہ رہ نوَردِ صبح و شام آتے نہیں

کون جانے وہ شہیدانِ محبت کون تھے!
زیست کی محفل میں پروانوں کے نام آتے نہیں

میرے آنسو دل شکن، اُن کے تبسّم دل فریب
یہ بھی کام آتے نہیں اور وہ بھی کام آتے نہیں

رقص جام بادہ کیسا اور کہاں کا دورِ مے
ہاتھ سو جاتے ہیں، ہونٹوں تک یہ جام آتے نہیں

ہر نفس ٹھہرا ہوا ہوں اور سفر میں ہوں نشورؔ
ہر مسافر کو یہ اندازِ خرام آتے نہیں

۷؍ جولائی ۱۹۷۰ء

وہ عمر جو دُنیا میں بسر کرتے رہے ہیں
اِک لمحۂ مستی میں سفر کرتے رہے ہیں

یہ حُسن بھی اِک آگ ہے اور عشق بھی اِک آگ
انگاروں میں شعلوں پہ نظر کرتے رہے ہیں

زُلفوں کی گھنی چھاؤں ہو یا دورِ مصائب!
جو شام بھی آئی ہے سحر کرتے رہے ہیں

وہ ایک تبسم میں چھپا لے گئے سب کچھ
نالے مرے اُن پر بھی اثر کرتے رہے ہیں

ہم نے بھی نگاہوں سے انہیں چھو ہی لیا ہے
آئینہ کا رُخ جب وہ ادھر کرتے رہے ہیں

گلزار میں بہتی رہیں، دولت کی بھی نہریں
شاعر ہیں کہ شبنم پہ گزر کرتے رہے ہیں

ہم لوگ تنور آج ہیں سائنس کے رہبر
مدت سے ستاروں پہ سفر کرتے رہے ہیں

۲۶ر مارچ سنہ ۱۹۷۰ء

یہ آنسو[۱] جو پلکوں پہ آئے ہوئے ہیں
ستارے یہاں سر جھکائے ہوئے ہیں

نگاہوں کا اک نام حُسنِ ادا بھی
یہ جادو بھی اپنے جگائے ہوئے ہیں

دو طرفہ قطاریں ہیں پھولوں کی لیکن!
ہمیں ہیں جو دامن بچائے ہوئے ہیں

محبت کے اک زخم کا تذکرہ کیا
زمانے کی ٹھوکر بھی کھائے ہوئے ہیں

شریکِ غم و درد کوئی نہیں ہے
ہم اپنا جنازہ اُٹھائے ہوئے ہیں

۱۱؍ اگست ۱۹۶۹ء

[۱] اس غزل کے چند اشعار مجموعۂ کلام "گُل افشانیٔ گفتار" میں شامل ہیں، کچھ اشعار رہ گئے تھے وہ اس مجموعہ کی زینت ہیں۔

ایک رات آتی ہے، ایک رات جاتی ہے
گیسوؤں کے سائے میں کس کو نیند آتی ہے

سلسلہ غمِ دل کا بے سبب نظر آیا
شمع سے کوئی پوچھے کیوں لہو جلاتی ہے

حُسن سے بھی کچھ بڑھ کر بے نیاز ہے یہ غم
داغِ دل محبت بھی گن کے بھول جاتی ہے

نام پڑ گیا اس کا کوچۂ حرم لیکن
یہ گلی بھی اے زاہد میکدے کو جاتی ہے

چلتے چلتے نبضِ غم، ڈوبتی ہے یوں اکثر
اک تھکے مسافر کو جیسے نیند آتی ہے

ہاتھ رکھتی جاتی ہے یاس دِل کے داغوں پر
میں دیا جلاتا ہوں، وہ دیا بجھاتی ہے

مٹ گئے نشورؔ آکر، ذہن میں ہزاروں غم
شعریت کا عالم بھی رمزِ بے ثباتی ہے

(۳۰ اپریل ۱۹۶۹ء)

اس غزل کے تین شعر مجموعۂ کلام "گل افشانیٔ گفتار" میں شامل ہیں۔

دِل کی یہ شکستگی بہت ہے
اِک لمحہ آگہی بہت ہے

جینے کا اگر ہو کچھ سلیقہ
تھوڑی سہی یہ زندگی بہت ہے

آگے نہ ابھی قدم بڑھانا
رُک جاؤ کہ روشنی بہت ہے

نازک ہو اگر دلِ محبت
اِک پھول کی پنکھڑی بہت ہے

کِس کِس کو کرے سلام کوئی
خالق ہی کی بندگی بہت ہے

یاد ان کو کیا کہ آ گئے یہ
ان اشکوں کی زندگی بہت ہے

ہر قطرہ کا ہے حساب دینا
ساقی کی نظر کڑی بہت ہے

تاریخِ بشر کی رہبری کو
اک کوچۂ دلبری بہت ہے

واقف ہے نگاہِ شوق سے بھی
وہ جلوہ جو اجنبی بہت ہے

اک آہِ فسردہ ہے لبوں پر
اور وہ بھی رُکی تھمی بہت ہے

ویرانہ نہیں نشور کا دل
بستی ہے مگر لٹی بہت ہے

۲۷ جنوری سنہ ۱۹۶۸ء لکھنؤ۔ سراج لکھنوی کی پہلی یادگار کے موقع پر

بہار آئی مگر مسکرا کے لوٹ گئی
غموں کی شاخ پہ شمعیں جلا کے لوٹ گئی

سیاہ زُلف جو اُن کروٹوں میں دَب سی گئی
وہ ناگنوں کی طرح چوٹ کھا کے لوٹ گئی

صَبا بھی چوُر سی ہے، رنگ و بُو کی گلیوں میں
کلی تھی خواب میں، وہ گدگدا کے لوٹ گئی

سبھی گناہ میں آلودہ تھے تو رحمتِ عام
اندھیری رات کا پردا گرا کے لوٹ گئی

ترے جمال کی تابندگی کے عالم میں
کرن جو آئی تو کچھ جگمگا کے لوٹ گئی

دبے قدم جو کسی رات تیری یاد آئی
اکیلے گھر میں دیا سا جلا کے لوٹ گئی

بڑے بڑوں کی جو شہرت اِدھر کو آئی نشورؔ
سخن شناس سے آنکھیں چرا کے لوٹ گئی

۲۴ دسمبر ۱۹۶۷ء بفرمائش اردو مجلس ریڈیو دہلی

ہوائے دیر و کعبہ ہے تو میخانوں میں کیوں آئے
خزاں پرور جو موسم ہے گلستانوں میں کیوں آئے

غمِ دل، ایک عنوانِ اہتمامِ لفظ و معنیٰ کا
حقیقت جب یہاں پہنچی تو افسانوں میں کیوں آئے

غزل آوارۂ اندازِ گلبازی سہی لیکن!
یہ دوشیزہ نئی دُنیا کے نادانوں میں کیوں آئے

یہ سب ساحل پہ اپنا اپنا سودا بیچ لیتے ہیں
جو قومی رہنما کوئی ہے طوفانوں میں کیوں آئے

فرشتے درد کے رقصاں تری غمگیں نوائی پر
ترا نغمہ نشورؔ اس دور کے گانوں میں کیوں آئے

الٰہ آباد ۔ ۸ نومبر ۱۹۶۷ء

اس گلستاں میں یہی رسم چلی جاتی ہے
پنکھڑی پھولوں کی قدموں سے مِلی جاتی ہے

کبھی نکلے، کبھی ڈوبے، کبھی چھلکے آنسو
غم میں اشکوں سے یوں ہی چھیڑ چلی جاتی ہے

اُن کی مخمور نگاہوں میں ہے کیا جانئے کیا
دل کے پیمانے میں صہبا سی ڈھلی جاتی ہے

وہ رقابت کے ہوں شعلے کہ محبّت کی تپش
اپنی ہی آگ میں ہر شمع جلی جاتی ہے

زندگی کم ہے جرائم کی بہ فیضِ غمِ دوست
موت اُن کی بھی نہ سمجھو کہ ٹلی جاتی ہے

رات کے وقت غم انگیز حکایت کو نہ چھیڑ
آگ جلتی ہے تو جلتی ہی چلی جاتی ہے

دونوں جانب ہیں تکلّف کے گھروندے آباد
دُور تک عشق و محبّت کی گلی جاتی ہے

اِنتظارِ سحرِ ناز کا عالم مت پوُچھ
رات کی رات ان آنکھوں میں ڈھلی جاتی ہے

سجدہ کرنے کی جگہ کوئے ملامت ہے نشورؔ
خاک اس کوچہ کی آنکھوں سے مَلی جاتی ہے

(۲۲، اکتوبر ۶۷ء۔ مکرانہ)

دھڑکنیں قلبِ حسیں سے لے لو
دِل کسی ماہ جبیں سے لے لو

مَرنے والوں کا بھی اِک اَندازہ
اُن کے اَندازِ حسیں سے لے لو

گیسوؤں والے بھی دِل رکھتے ہیں
غم جو چاہو تو انہیں سے لے لو

منتشر سی ہے خرابات کی شام
رنگِ پیمانہ کہیں سے لے لو

غم سے خالی ہیں فلک کے گوشے
دَرد چاہو تو زمیں سے لے لو

چاندنی چوک ہو یا شامِ بہار
ہار پھولوں کے کہیں سے لے لو

کیوں بھٹکتے ہو اَندھیروں میں نشورؔ
روشنی صبحِ یقیں سے لے لو

ماہِ نو نئی دہلی ۸ اگست ۱۹۶۷ء

منزلِ عشق میں کچھ درد کے عنواں بھی مِلے
اسی کوچے میں محبت کے چراغاں بھی مِلے

رونے والوں ہی نے گُل برگ سے پونچھے آنسو
شبنم افشاں جو ہوئے تھے وہ گُل افشاں بھی مِلے

فخر کرتے تھے جو کعبہ کی نگہبانی پر
وقت آیا تو وہی دشمنِ ایماں بھی مِلے

آج پھر چُپ سے ہیں آئینِ چمن بندی پر
ہم جو کل شاخِ نشیمن پہ غزلخواں بھی مِلے

دل ہے کیا چیز اُنھوں نے کبھی پوچھا تھا نشورؔ
آئنہ سامنے رکھا تھا تو حیراں بھی مِلے

۲۲ جولائی ۱۹۶۶ء

Scanned by CamScanner

چند افراد کو نفرت ہے اسی اُردو سے
گرمِ بازارِ قیادت ہے اسی اُردو سے

تُلسی و سُور کے نغمے ہوں کہ غالب کی نوا
یہ وطن زندہ حقیقت ہے اسی اُردو سے

ہُوں وہ چکبست کہ اقبال و نسیم و مُلّا
اہلِ کشمیر کی وقعت ہے اسی اُردو سے

یہ محبّت کی زباں ہے کہ جو اُس کے نقوش
اندرا کو بھی محبّت ہے اسی اُردو سے

زندہ رہتے ہیں فقط زندہ زبانوں والے
زندہ اے دوست یہ ملّت ہے اسی اُردو سے

شعر کیوں کہتے ہیں شاعر یہ نہ پُوچھو ہم سے
شاعروں کی یہ عنایت ہے اسی اُردو سے

۱۱ جولائی سنہ ۱۹۶۷ء

شام بھی اپنی رقیبوں کی سحر ہوتی ہے
دِل دھڑکتا ہے تو دُنیا کو خبر ہوتی ہے

یاس و اُمیّد میں کوئی بھی نہ ہارا آخر
ہے اِدھر دھوپ تو پرچھائیں اُدھر ہوتی ہے

ایشیا میں کوئی مذہب بھی رَوا دار نہیں
ایک تاریخ ہے جو خون میں تر ہوتی ہے

مُردہ دِل کیلئے کلیوں کی کسک بے معنیٰ
زندہ قوموں کو غمِ دل کی خبر ہوتی ہے

ہر ستارے پہ گماں تھا کوئی دِل ڈوب گیا
رات سے پوچھیئے! کِس طرح سحر ہوتی ہے

اپنی ہی آگ میں جلتا ہے ہر اک حسنِ نشور
لالہ و گل کی بھی شعلوں میں بسر ہوتی ہے

۱۲ر جون ۱۹۶۷ء

حسن و عشق اجتناب ہیں دونوں!
اک کھنچتی شراب ہیں دونوں!

عکس اور تیرگی بھی غیر نہیں
سایۂ آفتاب ہیں دونوں!

غم دوراں ہو یا غم جاناں!
اپنا اپنا جواب ہیں دونوں

حُسن خودبیں و عشق خود رفتہ
جگتی آنکھوں کا خواب ہیں دونوں

ان کی محفل میں یاس یا اُمید
اِک شکستہ رباب ہیں دونوں

یہ گنہگار اور زاہدِ عصر
دُور تک ہم رکاب ہیں دونوں

وقت اور وقت کے جلیسِ حیات
اچھے ہیں اور خراب ہیں دونوں

موت ہو یا حیات کچھ ہو نشورؔ
محورِ اضطراب ہیں دونوں

(یوم میر کیلئے (رضا ڈگری کالج۔ رام پور)
۸ر جنوری ۱۹۶۷ء)

دلِ و دلبر سبھی اب خواب سے بیدار ہیں دونوں
شریکِ محفلِ آرائشِ گفتار ہیں دونوں

عبادت خانہ ہائے کفر و ایماں میں گیا لیکن
ندا آئی کہ واپس جا یہاں غدار ہیں دونوں

یہ شیخ و برہمن جو ہوش میں تھے اب نشے میں ہیں
خدا کا نام لے کر برسرِ بیکار ہیں دونوں

چمن میں کیا ہوا گلچیں ہوا یا گل کا رکیا جانے
نظر آتا یہی ہے نرگسِ بیمار ہیں دونوں

درونِ حلقۂ گنگ و جمن ہے شعر کی دنیا
یہ دلّی، لکھنؤ بھی کچھ نہیں، اُس پار ہیں دونوں

Scanned by CamScanner

تغافل کی ادا ہو یا حکومت کی اداکاری
بُرا کس کو کہوں میرے لئے سرکار ہیں دونوں

جدھر دولت کی کرنیں ہیں اُدھر جاتا نہیں کوئی
وہ عاشق ہو کہ شاعر، سایۂ دیوار ہیں دونوں

نگاہِ اہلِ دُنیا ہو کہ چشمِ نیم خواب اُن کی
کبھی اقرار ہیں دونوں، کبھی اِنکار ہیں دونوں

کوئی شاعر نشورؔ ایسا نہیں جو مجھ سے مِلتا ہو
نئے ہوں یا پُرانے وقت کی تکرار ہیں دونوں

۶/ اکتوبر ۱۹۶۶ء صبح نو بجے

متفرقات

اِک روز تمہیں یوں مرا افسانہ کہو گے
جب ہوش میں آؤ گے تو دِیوانہ کہو گے
دیکھو گے اگر غور سے تہذیبِ جہاں کو
اِس دَور کو اک دَورِ بہیمانہ کہو گے

۲. اگست ۱۹۶۶ء

لہو دِل کا یہ دنیا مانگتی ہے
یہ مٹی ہے جو سونا مانگتی ہے

حیاتِ غم ہو یا مرگِ مے عیش
حقیقت کوئی پردا مانگتی ہے

جوانی شکوۂ سنجِ دردِ ہجراں
محبت شامِ تنہا مانگتی ہے

مری تیرہ نصیبی کچھ نہ پوچھو
سحر میری اُجالا مانگتی ہے

خرد کی ہر نظر مائل بہ تفریح
یہ بینائی تماشا مانگتی ہے

بڑا انعام ہے اے دوست غم بھی
کِسے مِلتا ہے، دُنیا مانگتی ہے

غرورِ حُسن ہو یا خونِ حسرت
وہ چشمِ مست صہبا مانگتی ہے

ہر اِک آغاز کا انجام دیکھا
یہ دُنیا کوئی عقبیٰ مانگتی ہے

نیا ذہن اور نئی کوشش نیا خون
کچھ اُردو سے معلےٰ مانگتی ہے

نشورؔ اب میں زبانِ اہلِ دل ہوں
مرے اشعار دنیا مانگتی ہے

کراچی ۲۹ مئی سنہ ۱۹۶۶ء

آج کے نوجوانوں سے خطاب

نظر نواز اشاروں کا اعتبار نہ کر
چمن میں زہرہ جبینوں کا انتظار نہ کر

کلی تو خیر کلی ہے شمیمِ گُل پہ نہ جا
گزرنے والی نسیمِ سحر سے پیار نہ کر

صبا سے پوچھ لے رستہ نظر کے کوچوں کا
رقیب کو کبھی ناداں شریکِ کار نہ کر

مشاعروں کی جو زینت ہیں ان کھلونوں کو
بتانِ انجمنِ شعر میں شمار نہ کر

جلا لے اپنے دیئے بادِ تند سے پہلے
کبھی تھمی ہوئی آندھی کا اعتبار نہ کر

جہاں نہ ہو ادب و شعر و حسن کی محفل
وہاں نشورؔ کے نغموں کا انتظار نہ کر

۲۳ اپریل ۱۹۶۶ء (حلیم مسلم کالج کانپور میگزین)

شکوہ کرے گلہ کرے، عُذرِ جفا کرے
کیوں خود کو انتشارِ غمِ مبتلا کرے

اے دوست اک ادھوری کہانی میں لطف ہے
جب انتہا قریب ہو پھر ابتدا کرے

وہ جس کے رنگ و نور سے معمور ہے حیات
گزرے اگر چمن سے تو کارِ صبا کرے

اس دور میں شعورِ محبت ہے پائمال!
عمرِ دراز بھی کوئی پائے تو کیا کرے

مجھ پر بھی کچھ خدا کی عنایت ہو تیرے ساتھ
تجھ کو کرے جو رِند مجھے پارسا کرے

مصروفِ شعر و فن کے تصرف میں ہے نشورؔ
دنیا یہ چاہتی ہے ترنم سنا کرے

۲۰ اپریل ۱۹۶۶ء

ہجومِ اشکِ غمِ سہی غموں کو آفریں کہو
ستارے ٹوٹتے رہیں انھیں کو مہ جبیں کہو

محبّت ایک ابتدا ہے جس قدر حسیں کہو
ہزار بار دیکھ کر نگاہِ اوّلیں کہو

ہزار گُل کھلا دیئے ہیں جادوئے نگاہ نے
طلسمِ جلوہ کچھ نہیں نظر کو آفریں کہو

ستم کا حوصلہ ہو تو سلیقہ پہلے سیکھ لو
جراحتوں کو گل کہو لہو کو آستیں کہو

گُلوں کو چُپ سی لگ گئی کلی کا منہ بھی بند ہے
چمن اگر ہوا نہ دے چمن کو نکتہ چیں کہو

وہ موت سے ڈرا نہیں جسے یقین تھا غیب پر
دِلوں کے اِنتشار کو حیاتِ بے یقیں کہو

چمن کا راز بھی کہو زبانِ عندلیب میں
ہمیشہ چُپ کی داد کیا جو بات ہو وہیں کہو

کلام اور کلیم میں بھی فرق ہے نگاہ کا
ادائے دِل نشیں کو کیوں کلامِ دلنشیں کہو

سمجھ سکو تو زندگی سفر کا اختتام ہے
یہاں کوئی قدم اُٹھے تو گامِ واپسیں کہو

نشورؔ لکھنؤ میں ہے اداے عروسِ شعر کی
جہاں حِنا کا رنگ ہو غزل وہیں حسیں کہو

(مشاعرہ ریڈیو لکھنؤ ۔ ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء)

حسنِ شعلہ ہے ہنسی کے دامن تلے
خود جلے، جو قریب آئے وہ بھی جلے

روئے تاباں سے زلفیں حسیں تر ہوئیں
چاند جتنا چڑھے رات اتنی ڈھلے

ان اداؤں میں کچھ نرمیاں آگئیں،
جیسے سونا پگھل جائے چاندی گلے

ان سے بچ کر گزرتا رہا عمر بھر
غم کی راہوں میں آتے رہے زلزلے

چپکے چپکے غمِ دل سے پھوٹے کرن
دھیمے دھیمے چراغِ محبت جلے

موت آئے تو اس کی خبر بھی نہ ہو
زندگی وہ ہے جو جان لے کر ٹلے

کوئی جلوہ ہو، شعلہ ہو، یا ساز ہو
کام ٹھنڈے لہو سے کہاں تک چلے

دِل جہاں تھا وہیں دِل کا حاصِل مِلا
کھو گئے فاصلے، سو گئے مرحلے

نفرتوں کی ہوائیں تو دھیمی پڑیں
اک چراغِ محبّت کہاں تک جلے

کیوں نہ آغوش میں لے اسے گلستاں
پا برہنہ جو کانٹوں پہ شبنم چلے

کس کو دیکھا کہ اپنا یہ عالم ہُوا
چھُٹ گئے زندگی کے حسیں مشغلے

حوصلہ کام آتا ہے لیکن نشورؔ
شاعری چاہتی ہے نئے وَلولے

جموں ریڈیو کے لئے ۱۰ فروری سنہ ۱۹۶۶ء

جاگ اے حیات جاگ، ابھی آدھی رات ہے
اے عشق کا سہاگ، ابھی آدھی رات ہے

شیشے کی جو پری ہے وہ عریاں ہے بزم میں
اڑنے لگے ہیں کاگ، ابھی آدھی رات ہے

اے عطرِ زندگی، ترِی انگڑائیاں دراز
اے شام کے سہاگ، ابھی آدھی رات ہے

جینا ہے صبح تک، تو نہ سانپوں سے کھیلنا
زلفیں ہیں کالے ناگ، ابھی آدھی رات ہے

توبہ قبول ہوتی ہے، کچھ اپنے وقت پر
بے وقت کا ہے تیاگ، ابھی آدھی رات ہے

ہے شام اور یہ نیند، یہ روٹھی ہوئی ادا
اے دوست جاگ جاگ ابھی آدھی رات ہے

سردی و تشنگی میں فسردہ ہے زندگی
ساقی اٹھا لے آگ، ابھی آدھی رات ہے

شاعر کو پوچھتا نہیں، یاں صبح کو کوئی
دہلی سے تو بھی بھاگ، ابھی آدھی رات ہے

اب بھی نشور سینے میں بجتا ہے اک ستار
اٹھ اے حسین راگ، ابھی آدھی رات ہے

۲۶ جنوری ۱۹۶۲

زِندگی میں عشق پر الزام پہلے آ گیا
بات جب نِکلی جنوں کا نام پہلے آ گیا

موت ہو یا زیست ہو اقدام ہے وجہِ کمال
جیت اس کی ہے جو وہ اک گام پہلے آ گیا

کوئی طائر جانبِ گلشن نہ آیا تھا مگر
کنج میں صیّاد لے کر دام پہلے آ گیا

ہے نشور اک تیرہ روزی کا تسلط آجکل
صبح کیا جانے کہ وقت شام پہلے آ گیا

غم جواں ہُوا مگر کیفِ زندگی نہیں
سب چراغ جل اُٹھے پھر بھی روشنی نہیں

اس سے کچھ نہ پوچھیے جو کلی کھلی نہیں
غنچگانِ راہ سے چھیڑ یہ نئی نہیں

اُن کے اِلتفات میں رُوٹھنے کی ہے ادا
بات کچھ ضرور ہے کوئی بات بھی نہیں

یوں تو بار بار ملی، صبحِ زندگی مگر
پہلی پہلی اک کرن مجھ کو بھولتی نہیں

میکدے کے اِرد گرد آخری کرن سی ہے
دوستو! رُکو ذرا شام ابھی گھنی نہیں

ہر سحر کے موڑ پر چونکتا ہے خواب سے
عشق کے شہید کی نیند آخری نہیں

جو رفیقِ راہ تھے سب چلے گئے نشورؔ
آج بزمِ اُنس میں لطفِ شاعری نہیں

۱۰ نومبر ۱۹۶۲ء

غم جواں و حسیں، رات کیسے کٹے
ہم کہیں وہ کہیں رات کیسے کٹے

کوئی دھوکا سہی، کوئی وعدہ سہی
بے گماں و یقیں، رات کیسے کٹے

پھر کسی نے پکارا کہیں دُور سے
ہر صدا دِل نشیں، رات کیسے کٹے

آؤ چل کر ذرا یہ گلی دیکھ لیں
میکدہ ہے کہیں، رات کیسے کٹے

خواب میں اُن کا مِلنا ہے ممکن مگر
نیند اپنی نہیں رات کیسے کٹے

کب تلک یہ نشورؔ اشک کا سلسلہ
تر ہوئی آستیں، رات کیسے کٹے

۱۲ دسمبر ۱۹۶۵ء

خاک اپنی غبار ہو گئی ہے
بجلی تھی شرار ہو گئی ہے

کیا لکھوں کہ چشمِ تر ہی میری
افسانہ نگار ہو گئی ہے

اس رخ سے ہر اک نظر پلٹ کر
تنقیدِ بہار ہو گئی ہے

تھی پھول کی اک کلی محبت
کانٹوں میں شمار ہو گئی ہے

اس دور کی زندگی نہ پوچھو
تلوار کی دھار ہو گئی ہے

ساحل پہ ہے رہزنوں کا خطرہ
کشتی ہے کہ پار ہو گئی ہے

خوشیوں کی برات چلتے چلتے
اشکوں کی قطار ہو گئی ہے

بدلی ہوئی اس نظر کو دیکھا
بے قول و قرار ہو گئی ہے

سب نقد خریدتے ہیں دوزخ
جنت جو اُدھار ہو گئی ہے

شیشے کی پری نشورؔ توبہ
دل لے کر فرار ہو گئی ہے

جہانِ نَو میں بھی اہلِ سِتم نہیں بدلے
خُدا بدل گئے، لیکن صنم نہیں بدلے

فریبِ میکدۂ نَو بھی سب نے دیکھ لیا
سفال ٹوٹ گئے جامِ جم نہیں بدلے

جو لوگ اگلے زمانے کی لاج رکھتے ہیں
وہ اس پہ خوش ہیں کہ ہم، کم سے کم نہیں بدلے

مرا سلام کہو جا کے بزمِ زاہد میں
جہاں بدل گئے پر، محترم نہیں بدلے

کوئی ہو قافلہ راہِ جنوں وہی ہے نشورؔ
قدم بدل گئے، نقشِ قدم نہیں بدلے

مشاعرہ جشنِ جمہوریت لال قلعہ دہلی
۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء

وہ بہکے ہوئے ہیں نہ تو ہم بہکے ہوئے ہیں
تھوڑا سا محبت کے قدم بہکے ہوئے ہیں

پلکوں نے لئے دامنِ رنگیں کے کنارے
آنسو ترے اے دیدۂ نم بہکے ہوئے ہیں

وہ حُسن کے مالک ہیں جسے چاہیں نوازیں
اچھے ہیں پر اندازِ کرم بہکے ہوئے ہیں

اب دیکھئے کیا گردشِ افلاک دکھائے
پھر چاند ستاروں کے قدم بہکے ہوئے ہیں

دُنیا کی ادا اور ہے اور اپنی ادا اور
سب مصلحت اندیش ہیں ہم بہکے ہوئے ہیں

میخانے میں اعزاز ملا بے خبروں کو
کم ظرف رہیں وہ لوگ جو کم بہکے ہوئے ہیں

ہے نام نشورؔ آج کی سُرخی میں نمایاں
پھر نامہ نگاروں کے قلم بہکے ہوئے ہیں

شیشوں میں شرابِ سحر و شام پڑی ہے
اے ساقیٔ میخانہ، تری بات بڑی ہے

یہ شام بھی تاریخِ شبِ غم کی کڑی ہے
ہر ایک ستارے سے یہاں آنکھ لڑی ہے

ہر لحظہ یہاں تُلتے ہیں اعمالِ خلائق
ہر لمحہ یہاں جیسے قیامت کی گھڑی ہے

سو دورِ خزاں دیکھ کے پھولی ہے ہر اک شاخ
غنچوں کی یہاں عمر بہاروں سے بڑی ہے

یہ خاکِ کفِ پا ہے، مٹائے نہ مٹے گی،
تو کس لئے، اے گردشِ تقدیر اَڑی ہے

اے گوشہ نشینانِ زیارت گہِ تہذیب
نکلو، کہ یہاں فصلِ جنوں اب بھی کھڑی ہے

ممکن ہے کہ یہ تیر نشانے پہ نہ پہونچے
بازو میں سکت کم ہے کماں اپنی کڑی ہے

گُل اپنے تبسّم میں مگن ہیں تو کہوں کیا
غنچوں کو کہاں یاد کہ اُس لب پہ دھڑی ہے

شاعر ہے نشورؔ آج زمانے کا پیمبر
خاموش کہ اس دور میں یہ بات بڑی ہے

۲۶ جنوری ۱۹۹۶ء یومِ جمہوریہ

خاموش ہیں لب، پر اشکوں کی تحریر کہاں لے جائے کوئی
کم کم ہی سہی، احساسِ الم تاثیر کہاں لے جائے کوئی

اس باغ کے رنج و راحت کی تعمیر کہاں لے جائے کوئی
وہ پھول چُنیں، ہم کانٹے لیں، تقدیر کہاں لے جائے کوئی

آزاد چمن، برباد وطن، سب کیلئے ہے اک قید ستم
دُنیا سے تعلق سب کو ہے زنجیر کہاں لے جائے کوئی

اپنی ہی خطا کا دُنیا میں انسان نشانہ بنتا ہے
اپنی ہی کماں، اپنا ہی جگر، یہ تیر کہاں لے جائے کوئی

مایوس ہے دل لیکن اے غم، ہے یاد تو اسکی اپنی جگہ
آئینہ تو اس نے توڑ دیا، تصویر کہاں لے جائے کوئی

ملبوسِ سحری سے اُنکے رنگین کرن چھنتی ہی رہی
وہ چاند چھپا لیں دامن میں، تنویر کہاں لے جائے کوئی

شاعر کے لئے یہ جُنبشِ لب، عنواں ہے نشور اک عظمت کا
خاموش لگن خدمت کی سہی، تقریر کہاں لے جائے کوئی

شاعر نوجوان ۔ ۲ جنوری ۱۹۶۲ء

اہلِ دانش روشِ عام سے آگے نہ گئے
انتظارِ سحر و شام سے آگے نہ گئے

عہدِ حاضر کے جواں تیز نظر تھے لیکن!
جلوہ گاہِ رم و آرام سے آگے نہ گئے

قافلے علم و عمل کے بھی شتاباں تھے مگر
وہ بھی اک کوششِ ناکام سے آگے نہ گئے

بتکدہ حسنِ خیالات کے تھے رہزنِ ہوش
اہلِ دیں کوچۂ اصنام سے آگے نہ گئے

منزل آگاہ نشورؔ اہلِ سخن تھے لیکن!
وہ بھی شورِ دلِ ناکام سے آگے نہ گئے

۶ جون ۱۹۵۵ء

اس مقتلِ وفا کی حدوں میں جو آ گئے
دیکھا یہی کہ اُن کے قدم ڈگمگا گئے

اہلِ خرد کا کام ہے تفریقِ کارواں
انسانیت کی راہ میں دیوار اُٹھا گئے

ساقی تری نگاہ کا شاید قصور ہو
یہ کیا ہُوا کہ ہوش میں دیوانے آ گئے

اب تک ہے بزمِ غیر میں بھی جس کی روشنی
کچھ لوگ تھے جو شمعِ محبت جلا گئے

جاتے نہیں نشورؔ کسی بزمِ ناز میں
اہلِ وفا کا نام سُنا تھا تو آ گئے

طرحی مشاعرہ ادبِ عالیہ کانپور —— ۱۶ نومبر ۱۹۴۲ء

Scanned by CamScanner

میں اپنی بزم سے اتنا ہی دُور ہوں کہ نشورؔ
مری نواؤں سے کچھ آشنا ہیں بیگانے

نشورؔ واحدی

نشور واحدی

☆

نشورؔ اک دور ہے مٹ کر تو کیا غم

دماغوں پر ہمیں چھائے ہوئے ہیں

نشورؔ واحدی

میں ابھی سے کس طرح ان کو بے وفا کہوں
منزلوں کی بات ہے راستے میں کیا کہوں

اے حریصِ میکدہ خونِ زندگی سہی
تو شراب گر پیئے تجھ کو پارسا کہوں

حُسنِ بے حجاب پر کوئی پردہ ڈال لو
تم اسے صنم کہو، میں اُسے خُدا کہوں

گیسوئے سیاہ کی یہ حسین درازیاں
رات کیوں کہوں انہیں رات کی دُعا کہوں

ترجمانِ راز ہوں یہ بھی کام ہے مرا
اس لبِ خموش نے مجھ سے جو کہا کہوں

غیر میرا حالِ غم، پوچھتے رہے مگر
دوستوں کی بات ہے دشمنوں سے کیا کہوں

امتحانِ شوق ہے، ایسی عاشقی نشورؔ
دل کا کوئی حال ہو اُن کو دِل رُبا کہوں

عزمِ محکم ۱۹۹۹ء

نورِ قمر نے میرے لئے اِک رشکِ قمر کو روک لیا ہے
اوّلِ شب سے آخرِ شب تک جس نے نظر کو روک لیا ہے

اُن کے خرامِ ناز کے آگے تھم سی گئی ہے گردشِ عالم
زُلفِ حسیں نے، نورِ جبیں نے شام و سحر کو روک لیا ہے

تم نے بنائے لاکھوں شیشے، عکس کسی میں بھی نہیں ٹھہرا
دل نے بنا کر آئینۂ غم آئینہ گر کو روک لیا ہے

پی کے بہکنا کوئی نہیں ہے، فکرِ نگوں کا نام ہے مستی
شیشۂ مے نے قافلہ ہائے فکر و نظر کو روک لیا ہے

اپنا نشورؔ انداز جدا ہے فکرِ حسیں سے آہِ رسا تک
ہم نے فضائے لالہ و گل میں برق و شرر کو روک لیا ہے

(گل افشانیٔ گفتار، ۱۹۶۶ء)

○

شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا
نہ کہیں ترا ٹھکانہ نہ کہیں مرا ٹھکانا

تجھے حسن و عشق دونوں ہی عطا ہوئے یہ کہہ کر
یہ چمن ہے مسکرانا یہ ندی ہے ڈوب جانا

کوئی آج تک نہ سمجھا کہ شباب ہے تو کیا ہے
یہی عمر جاگنے کی یہی نیند کا زمانا

جو ذرا سی آنکھ کھولی تو ہزار حشر دیکھے
یہ خودی جو سو رہی ہے اسے اب پھر جگانا

رُخ بدلتے راہ چلتے گلعذاروں کو نہ چھیڑ
اے چمن ناآشنا، رنگیں بہاروں کو نہ چھیڑ

لالہ و گُل میں بھی تجھ کو مُسکرانا ہے مگر!
ہر چمن میں مُسکرا کر غم کے ماروں کو نہ چھیڑ

شامِ غم ہے ماہ و انجُم کی طرف مُڑ کر نہ دیکھ
رات کی تاریکیوں میں چاند تاروں کو نہ چھیڑ

ھم نہ برگِ گُل، نہ شبنم، نے خس و خارِ چمن
اے نسیمِ صبح جا، ھم خاکساروں کو نہ چھیڑ

وہ کرم ناآشنا ہوں تو کرم فرما سمجھ
اِک سہارا ٹوٹتا ہے اعتباروں کو نہ چھیڑ

کانپتے ہونٹوں سے ناداں نام رُسوائی نہ لے
دِل دھڑکتا ہو تو دامن کے کناروں کو نہ چھیڑ

سُن کے اشعارِ نشورؔ اے دوست تنقیدیں نہ کر
گرتے دریا ہیں یہ ظالم، آبشاروں کو نہ چھیڑ

ہر ذرّہ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

تھا حسن مگر اک نگہِ نیم رضا سے
گیسو بہ کمر، لالہ شکن ہم نے بنایا

صد شکر کہ ہے اُن کا تبسم بھی ہمیں پر
کلیوں میں جنہیں غنچہ دہن ہم نے بنایا

اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی
اپنے لئے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

ہم جذبۂ آزادیٔ فطرت کو ہوا دی
ہر بادہ پیمانہ شکن ہم نے بنایا

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

ڈرتے ہیں خموشی سے ہماری مہ و انجم
چپ رہ کے وہ اندازِ سخن ہم نے بنایا

ٹکرائے کبھی موج سے ساحل پہ کبھی ہیں
بہتے ہوئے دریا میں وطن ہم نے بنایا

مستقبلِ تہذیب کا نغمہ وہی ٹھہرا
جو زمزمۂ گنگ و جمن ہم نے بنایا

آفاق کا ہر جلوۂ لنشور اس میں عیاں ہے
مل جُل کے وہ آئینۂ فن ہم نے بنایا

(فروغِ جام ۱۹۶۵ء)

پیراہنِ رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے
معصوم ہے کیا جانے، دامن کہیں جلتا ہے

میری مژہ غم پر لرزاں ہے حقیقت سی
ان کے لبِ لعلیں پر افسانہ مچلتا ہے

اچھی ہے، رہے تھوڑی یہ جلوہ طرازی بھی
رقصِ مہ و انجم میں، دیوانہ بہلتا ہے

عنوانِ ترقی ہے یہ تیرہ فضائی بھی
کچھ گرد بھی اٹھتی ہے جب قافلہ چلتا ہے

ہے شام ابھی کیا ہے، بہکی ہوئی باتیں ہیں
کچھ رات ڈھلے ساقی میخانہ سنبھلتا ہے

بس دیکھ چکی دُنیا، یہ بزم فروزی بھی
رکھا ہے چراغ ایسا، بجھتا ہے نہ جلتا ہے

اِک سحرِ شبستاں ہے یہ فنِ جہاں رانی
دُنیا ہے کہ سوتی ہے جادُو ہے کہ چلتا ہے

افلاک کے آنسو سے طوفاں بھی لرزتے ہیں
شعلوں کا جگر گویا شبنم سے دہلتا ہے

مُضطر بہ لبِ لعلیں ساقی بہ مۓ و مینا
اس گرمیٔ محفل میں ایمان پگھلتا ہے

دیکھا ہے نشورؔ ان کو غم دیدہ و نم دیدہ
فطرت بھی بدلتی ہے، شاعر بھی بدلتا ہے

(فروغِ جام ۱۹۵۹ء)

اِک دامنِ رنگیں لہرایا، مستی سی فضا میں چھا ہی گئی
جب سیرِ چمن کو وہ نکلے، پھولوں کی جبیں شرما ہی گئی

یہ صحنِ چمن یہ باغِ جہاں خالی تو نہ تھا نکہت سے مگر
کچھ دامنِ گُل سے دُور تھا میں کچھ بادِ صبا کترا ہی گئی

احساسِ الم اور پاسِ حیا، اس وقت کا آنسو صہبا ہے
اس چشمِ حسیں کو کیا کہیے جب پی نہ سکی چھلکا ہی گئی

ہر شعلہ گرِ عہدِ ظلمت انجام سے اپنے ڈرتا ہے
جب ذکرِ سحر محفل میں چھڑا کچھ شمع کی لَو تھرّا ہی گئی

اس دور میں کتنے شیخِ حرم مے خانے کا رستہ پوچھ گئے
ساقی کی نظر بیگانہ سہی، کچھ کارِ جہاں سمجھا ہی گئی

تہذیب کے رعنا پیکر سے یہ بارِ امانت اُٹھ نہ سکا
ناظورۂ عہدِ حاضر کی نازک تھی کمر بل کھا ہی گئی

زہرابِ زمانہ پی پی کر جو اہلِ جنوں تھے راہ لگے
شاعر کو نشورؔ اک ذلتِ دوراں غم دے نہ سکی الجھا ہی گئی

فروغِ جام ۱۹۵۹ء

جانبازوں کے لئے پر بھی اب عیش کا نام آیا
جس ہاتھ میں تیشہ تھا اُس ہاتھ میں جام آیا

اک تازہ تغیر ہے تہذیب کی دُنیا میں
یا حُسنِ حقیقی کو، اندازِ خرام آیا

راحت کا تصور ہی باقی نہ رہا شاید
ہونٹوں پہ تکلف سے، آرام کا نام آیا

کچھ سوچ کے اک راہِ پُرخار سے گزرا تھا
کانٹے بھی نہ راس آئے دامن بھی نہ کام آیا

جانبازوں کے لئے پر بھی اب عیش کا نام آیا
جس ہاتھ میں تیشہ تھا اُس ہاتھ میں جام آیا

اک تازہ تغیر ہے تہذیب کی دُنیا میں
یا حُسنِ حقیقی کو، اندازِ خرام آیا

راحت کا تصوّر ہی باقی نہ رہا شاید
ہونٹوں پہ تکلف سے، آرام کا نام آیا

کچھ سوچ کے اک راہِ پُرخار سے گزرا تھا
کانٹے بھی نہ راس آئے دامن بھی نہ کام آیا

ساقی یہ حریفوں کو پہچان کے دینا کیا
جب بزم سے ہم نکلے تب دور میں جام آیا

اس تیرہ نصیبی میں کرنوں کا سہارا کیا
سُورج کی طرف دیکھا وہ بھی لبِ بام آیا

یہ راز و نیازِ غم کچھ وہ بھی سمجھتے ہیں
جب چوٹ پڑی دِل پر پلکوں کو سلام آیا

پھینکے ہوئے شیشوں سے دِل کتنے بنائے ہیں
جب جام کوئی ٹوٹا، دیوانوں کے کام آیا

اشعارِ نشورؔ اکثر ان کی بھی زباں پر ہیں
چُپ رہ نہ سکا کوئی جب وقتِ کلام آیا

فروری ۱۹۵۹ء

نہیں حسن، اب شمع فانوس خانہ
یہ گیسو بکھرتے ہیں شانہ بشانہ

اُمنڈتے ہیں آنسو جو چھیڑو فسانہ
یہ آنکھیں بھی کچھ ڈھونڈتی ہیں بہانہ

بہت کم تھی عمرِ نگاہ و تبسّم
سحر تک نہ تھا التفاتِ شبانہ

مِرے آنسوؤں کی ادا کون سمجھے
گلوں کا تبسّم نہ سمجھا زمانہ

ابھی اور بجلی ہے درکارِ گلشن
ابھی سرد ہے شعلۂ آشیانہ

کسی شام نے اُن کے گیسو جو کھولے
مَیں بھولا نسیمِ سحر کا فسانہ

نشورؔ اَب غزل ہے حیاتِ دوعالم
یہ عنوانِ زُلف و کمر اک بہانہ

(فروغِ جام ۱۹۵۹ء)

مرا دل نہ تھا اَلم آشنا کہ تری ادا پہ نظر پڑی
وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بِنائے خونِ جگر پڑی

مری زندگی تھی کہ منزلِ تب و تابِ غم میں اُتر پڑی
نہ جنوں کی رہگزر ملی، نہ خرد کی راہ گذر پڑی

جسے چاہے مالکِ رنگ و بُو، اسی بے رُخی میں نواز دے
مَیں اِدھر تھا منتظرِ کرم، وہ نگاہِ ناز اُدھر پڑی

ترا کام سیرِ مدام ہے، نہ کہ گلستانوں میں ٹھیرنا
یہ کلی کلی کے قریب ہیں، تو کہاں سے بادِ سحر پڑی

کوئی موج بحر سے دُور ہے تو جبینِ بحر پہ کیا شکن
تری رحمتوں کو ہُوا یہ کیا، مری لغزشوں پر نظر پڑی

وہ بہار آنے کا شور اُٹھا کہ نظامِ ہوش بھی کھو گیا
نہ چمن رہا نہ وہ آشیاں جو نگاہ بارِ دِگر پڑی

تجھے کیا ہو قدرِ ملال کی، تو ہے نارسیدۂ زندگی
جو بہت بکھرے ہیں گلی گلی تو جبیں پہ گردِ سفر پڑی

جو حدودِ صبح میں رُک گیا، اُسے اتفاقِ سفر کہو
مَیں وہی مسافرِ شام ہوں، مرے راستہ میں سحر پڑی

بہ نگاہِ ساقیِ مہر و مہ کبھی خالی جام نہیں رہا
میں زمیں پہ ڈھونڈ رہا تھا کچھ، کہ وہ کہکشاں سے اُتر پڑی

سرِ راہ اُن کو بیک نظر کبھی دیکھئے تو وہی ادا
وہی بے نیازیٔ مہ وشاں، وہی زلف تا بہ کمر پڑی

جو ورودِ اہلِ سخن ہُوا تو ہجومِ شام اِدھر بڑھا
وہ غزل نشورؔ کی ہو گئی، نئی محفلوں میں خبر پڑی

(فروغِ جام ۱۹۵۹ء)

اس دل کی مصیبت کون سُنے جو غم کے مقابل آ جائے
کس نے یہ کہا تھا نکلے سے وہ بجلی سے ٹکرا جائے

دُنیا کی بہاروں سے آنکھیں یُوں پھیر لیں جانے والوں نے
جیسے کوئی لمبے قصّے کو پڑھتے پڑھتے اُکتا جائے

آغازِ محبت ہے اور دل یوں ہاتھ سے نکلا جاتا ہے
جیسے کسی اَلھڑ کا آنچل سرکا جائے ڈھلکا جائے

گُزرے ہُوئے دلکش لمحوں کی بھُولی ہوئی یاد ایسی آئی
جیسے کوئی بیتم پردیسی سوتے میں اچانک آ جائے

جب پہلے پہل محسوس ہُوا ہے حُسن تو دِل ایسا کانپا
جیسے کہ دُلہن پہلی شب کی آہٹ جو مِلے تھرّا جائے

کنگھے سے گھنیری زُلفوں میں، یوں لہریں اُٹھتی جاتی ہیں،
جیسے کہ دُھندلکا ساون کا بڑھتا جائے بڑھتا جائے

ہستی کا نظارہ کیا کہیے مرتا ہے کوئی جیتا ہے کوئی
جیسے کہ دِوالی ہو کہ دِیا جلتا جائے بُجھتا جائے

اِک آس جو دِل کی ٹوٹ گئی پھر دل کی خوشی باقی نہ رہی
جیسے کہ اندھیرے گھر کا دِیا گُل ہو تو اندھیرا چھا جائے

دِل ہے کہ نشورؔ، اِک باجا ہے سینے کے اندر تاروں کا
جب چوٹ پڑے جھنکار اُٹھے جب ٹھیس لگے تھرّا جائے

[illegible]

دِیا سَاقی نے اوّل روز وہ پیمانہ مستی میں
کہ میں نا آشنا پی کر ہُوا دِیوانہ مستی میں

مِری پُوجا تھی کیف انگیز نظروں کی پرستاری
مِرا سجدہ تھا پیشِ ابروئے جانانہ مستی میں

شرابِ آتشیں وہ ہے کہ دو اِک گھونٹ پینے میں
جو سَاقی ہو تو آتا ہے نظر پیمانہ مستی میں

کوئی کہتا ہے مسجد ہے کوئی کہتا ہے باہر جا
الٰہی! کیا میں بھولا ہوں رہِ میخانہ مستی میں

نظر آتا ہے مجھ کو بوریا بھی تختِ طاؤسی
گدا رکھتا ہے گویا سطوتِ شاہانہ مستی میں

نشہ تھا مجھ کو اور یاروں نے چاہا چھین لیں بوتل
مگر کام آگئی کچھ جرأتِ رندانہ مستی میں

خبر کیا تھی کہ واعظ ہے، یہی سمجھا کہ ساقی ہے
اُٹھا اور اُٹھ کے جا لپٹا میں بیتابانہ مستی میں

قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں جا کر
نشورؔ اس وقت ہوں کچھ ہوش سے بیگانہ مستی میں

جنوری ۱۹۳۹ء

کبھی سُنتے ہیں عقل و ہوش کی اور کم بھی پیتے ہیں
کبھی ساقی کی نظریں دیکھ کر پیہم بھی پیتے ہیں

خزاں کی فصل ہو، روزے کے ایّامِ مبارک ہوں
طبیعت لہر پر آئی تو بے موسم بھی پیتے ہیں

کہاں تم دوستوں کے سامنے بھی پی نہیں سکتے
کہاں ہم رُوبرُوئے ناصحِ برہم بھی پیتے ہیں

طوافِ کعبہ بے کیفیّتِ مے ہو نہیں سکتا
مِلا لیتے ہیں تھوڑی سی اگر زمزم بھی پیتے ہیں

کہاں کی توبہ، کیسا اِتّقا، عہدِ جوانی میں
اگر سمجھو تو آؤ تم بھی چکھو، ہم بھی پیتے ہیں

نشورؔ آلودۂ عصیاں سہی، پھر کون باقی ہے!
یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی :

"نشور واحدی کی غزلیں بلاشبہ زندگی سے بھرپور، پاکیزہ خیالات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ زبان، بیان، انداز افکار و تجربات ان کے اپنے ہیں، اور ان کے اپنے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔"

دورِ رفتہ کی یادگار تصویر

نشور واحدی، جگر مراد آبادی (بائیں جانب) مسعود اختر جمال کے ساتھ

اکٹر سید عبدالباری :

"غزل کے دیگر شاعروں سے الگ نشور کا ل اپنی ایک انوکھی انفرادیت اور امتیاز اہے۔ ان کی موسیقیت اور ان کے لحن سے ان کی آرزو مندی، ولولہ انگیزی اور تصوف ق کی تابندہ روایات سے ان کا والہانہ تعلق سحور بنا دیتا ہے۔"